غزلیات

سلیم گورمانی

ڈھونڈ مت کُنجِ اَماں دوزخ میں
گوشۂ خُلد کہاں دوزخ میں
جس طرح مل گئی ہو ان کو بہشت
خوش ہیں اِیذا طَلَباں دوزخ میں
نہیں معلوم جزا ہے کہ سزا
جسم جنت میں ہے جاں دوزخ میں
سب ہیں مصروفِ اَلَم اَندوزی
کِس کو فرصت ہے یہاں دوزخ میں
گئی بے کار مِری نالہ گری
کون سُنتا ہے فغاں دوزخ میں

☆☆☆

دِل پہ جو دُھول جمی ہے نہیں دھونے والا
یہ دُھواں ابرِ کرم تو نہیں ہونے والا
گِھر کے آیا ہے مرے مطلعِ جاں پر جو، یہ غم
چھٹنے والا ہے نہ پلکوں کو بھگونے والا
اب تک آتی ہے کِسی گھر سے فغانِ طِفلک
جا چکا کب کا صَدا دے کے کھلونے والا
کیا کِیا تو نے اے ناواقفِ آداب ستم!
رونے والا تو نہ تھا پھوٹ کے رونے والا
فصل اُٹھاتا ہُوں جو بوئی تھی بزرگوں نے سلیم
کاٹتا کون ہے اور کون تھا بونے والا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔ حج

جب سے انسان نے آنکھ کھولی ہے وہ اسی تگ وتاز میں غلطاں و پیچاں رہا کہ وہ کون سی صورت پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن وسلامتی سے رہ سکیں۔ اسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان گنت تجارب کی بھٹیوں اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن وہ مقصود حاصل نہ کر سکا۔ زمان و مکاں ہر آن بدلتے رہے۔ نظریات حیات میدان تصادم میں برسر پیکار رہے۔ Antithesis, Thesis اور Synthesis کا عمل عقل محض کی ابلہ فریبیوں میں عافیت کوش رہا۔ اس طرح انسان اپنے ہی ہاتھوں سراب کا شکار ہوتا رہا۔ مدت کے بعد پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر اقوام مغرب نے جمیعتہ الاقوام' (League of Nations) کی طرح ڈالی جو کردار اور عمل کے فقدان کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے تو اسے کفن چوروں کی جماعت کہا تھا۔ اس کی ناکامی کی وجہ (Mr. Reeves) اپنی کتاب (Anatomy of Peace) میں لکھتا ہے کہ ''لیگ آف نیشنز'' کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یک جا کر کے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس ناکام تجربے کے بعد ''لیگ آف نیشنز'' کی جگہ یعنی اس کا نام بدل کر (United Nations Organisation) اقوام متحدہ کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس طرح سے یہ ناکام ہوئی ہے۔ اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ اس طرح کہ اس کی ایک سیکیورٹی کونسل ہے جس کے پندرہ مستقل رکن ہیں۔ ان میں سے پانچ یعنی امریکہ' برطانیہ' فرانس' روس اور چین کو حق استرداد (Veto) کا اختیار دیا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ سیکیورٹی کونسل منظور کر دے تو ان میں سے کوئی رکن بھی اسے رد (Veto) کر سکتا ہے جس سے تمام کارروائی منسوخ ہو جاتی ہے۔ گویا ان کا یہ عمل ان کے اپنے وجود کی نفی ہے۔ ظاہر ہے جو جماعت اپنے وجود کی خود نفی کر دے منطقی طور پر (Virtually) اس تنظیم نے پورے کے پورے ادارے کو کالعدم کرنے کے خود اسباب پیدا کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ دوسری اقوام کو تو چھوڑیئے' مسلمانوں کا کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ کشمیر کا مسئلہ 1948ء سے اس کے ایجنڈا پر ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اسرائیل سے عرب علاقے خالی نہیں

کراسکی۔افغانستان اورعراق آ گ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔اس کا کوئی فیصلہ نہیں کراسکی۔یہ چند مسائل ہیں جن کا تعلق عالم اسلام سے ہے۔باقی علاقوں کے مسائل کا بھی کوئی خاطرخواہ حل نہیں ہوسکا۔کافی عرصہ ہوالندن کے اخبار''ڈیلی میل'' نے لکھا تھا کہ جمعیت اقوام اپنی موجودہ ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرہ کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کردینا چاہئے'' اوراس کی وجہ (Mr. Reeves) کے الفاظ میں یہ ہے کہ''ہمارے سامنے جومسئلہ ہے۔وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جوخلجان پیدا کررکھا ہے اسے کس طرح دورکیا جائے۔اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعے دورنہیں ہوسکتا۔جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوع انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔یعنی یہ وہی چیز ہے جسے علامہ اقبال نے کہیں پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

یہ حشر ہوااس نظریہ حیات کا جووحی کی راہنمائی سے محروم تھااورصرف عقل کے گھوڑے پرسوارتھا۔

لیکن صدیوں پہلے وحدت آدم کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے مرکز انسانیت یعنی خانہ کعبہ کوازسرِنوتعمیرکیا کیونکہ مرکز کے بغیرانسانوں کاایک برادری بنااور ایک پلیٹ فارم پرجمع ہوناناممکن ہے۔چنانچہ جب تعمیرکعبہ مکمل ہوچکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہاواذن فی الناس بالحج (22/27)''تمام نوع انسانی کو یہاں جمع ہونے (حج) کااعلان کردے''اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ لیشھدوا منافع لھم (22/28)''تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ نظام خداوندی کس طرح عالمگیرانسانیت کی منفعت بخشیوں کا ضامن ہے۔''

نصوص قرآنی سے حج کی جوتفصیلات ظاہرہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ تمام دنیا کے انسان بلاتفریق رنگ ونسل اور بلا امتیاز وطن وزبان' جواس نصب العین پرایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پرحکومت کرنے کا حق نہیں' محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے' جوانسانی تقاضوں کا ترجمان ہے' اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیرکی زیرقیادت' مرکز وحدت انسانیت' یعنی بیت اللہ کی طرف روانہ ہوں۔عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔پھر یہ تمام امرا اپنے میں سے ایک امیرالامرا کاانتخاب کرلیں اورمختلف ممالک

کے احوال وظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کر لیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''سالانہ ترقیاتی پروگرام'' (Annual Development Programme) کہا جاتا ہے۔ پھر ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اسی پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان' مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر ان کے (Pros and Cons) کا عملی اثر اور ردعمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں گے' اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی ہوں گی جس کے لئے بھیمۃ الانعام (5/11) کا ذبیحہ تجویز کیا گیا ہے جسے عرف عام میں قربانی کہتے ہیں۔ آخر میں یہ نمائندگان طواف کعبہ کے بعد اپنے اپنے ملکوں میں واپس آ جائیں گے اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں اور نظم ونسق کو چلائیں گے۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن حکیم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے اس اجتماع کی مکمل کارروائی کے لئے کم از کم تین مہینے بتائے ہیں۔ الحج اشھر معلومٰت (2/197) اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

یہیں سے اقوام متحدہ نے بھی اپنے سالانہ اجلاس کے لئے کم از کم تین مہینے مقرر کر رکھے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

فریضۂ حج کا تقاضا ہے کہ اپنے اپنے ممالک کو لوٹ کر سب کچھ بھولنا نہیں بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو دنیا کے کسی گوشہ میں بھی ہو' زندگی کے کسی شعبہ میں مصروف تگ وتاز ہو اپنی توجہات کا رخ اسی مرکز کی طرف رکھو اور جو پروگرام وہاں سے مرتب کر کے لائے تھے۔ اس کا احترام کرنا ہوگا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہوگا' کیونکہ آئندہ سال اپنی Progress Report وہیں جا کر پیش کرنا ہوں گی۔ اسی لئے خانہ کعبہ کو قبلہ کہا گیا ہے جس کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا جائے۔ اگر کسی وجہ سے تکمیل پروگرام (A-D-P) میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے (Bottle Necks) حج کے دوران بیان کرنا ہوں گے تاکہ ان کا تدارک کیا جا سکے۔ اسی لئے حج کا مقصود قرآن حکیم میں خاص طور پر دو مقامات پر مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک لیشھدوا منافع لھم 22/28 تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غائت قیاماً للناس 5/97 یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ حج سے مقصود جمعیت آدم'' کی تشکیل تھا۔ لیکن آج حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کی لامرکزیت کی وجہ سے عالم اسلام چاروں طرف سے مصائب سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشہ پر کہیں انکا نشان رہنے نہ پائے۔ لیکن ملت اسلامیہ تختۂ

غفلت پر سوئی ہوئی خراٹے لے رہی ہے۔ مسلمان ملکوں پر جو گزر رہی ہے آسمان کی آنکھ بھی اس پر پرنم ہے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم و تشدد پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے''۔ القرآن 4/75۔

پاکستان تو کجا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو خدا کے متذکرہ حکم کے تحت مسلمانوں کی مدد کو پہنچ سکے؟ یہ وہی معاشرہ یعنی مرکز ملت (Central Authority) ہو سکتا تھا جس کی خصوصیت اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی کہ ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسلامی معاشرہ یعنی مرکز ملت کی حیثیت آنکھ جیسی ہوتی ہے۔ اگر انسانی جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہو تو آنکھ کو چین نہیں۔ اسی طرح اگر دنیا کے کسی حصہ میں کسی ایک مسلمان پر بھی ظلم ہو رہا ہو تو مرکز ملت حرکت میں آ جاتا ہے اور ظلم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ لیکن افسوس! اس وقت وہ مرکز ملت کہاں جو قرآن کے قانون اور حکم کی قوت نافذہ بنتا!

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

ہماری لامرکزیت ہمارے زوال اور انحطاط کا سبب ہے۔ اس لئے حج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنس منعقد کرنے پر ہی اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر کچھ نہیں ہو سکا۔ لیکن ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ نمی تمسک بالقرآن سے پیدا ہو گی اور پھر جب ہم نے اپنے اللہ سے' بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا' جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے' اقوام عالم کی امامت ہمارے حصے میں آ جائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز و شاداب ہو گی۔ آج مسلمانوں کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس

الانتقاد السدَ ادفی اصول الاجتہاد

ارشاد حضرت باری تعالیٰ عز اسمہٗ ہے کہ لا تتخذوا الٰھین اثنین انما ھو اللہ واحد (16/51)۔تم دو الٰہ نہ بنا لینا' الٰہ وہی ایک ہے۔ یہ آیت کریمہ بڑی عظیم وجلیل ہے جس کا تعلق منکرین خدا سے نہیں ہے بلکہ خدا کے ماننے والوں' ہم مسلمانوں سے ہے۔ یہ کفر و اسلام' شرک وتوحید کے درمیان حد تفریق اور خط امتیاز ہے' لیکن اس آیت کریمہ کا مالہٗ وما علیہٗ اس کی عظمت و جلالت' رفعت و شوکت' اس کی تابندگی اور درخشندگی اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب الٰہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے اور یہ سمجھ میں آجائے کہ قرآن کریم نے الٰہ کا لفظ حاکم کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے علی الرغم بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کی کوشش جاری رکھی تو فرعون نے حضرت موسیٰ کو سخت زجر و توبیخ کی اور اعلان کیا کہ وان اتخذت الٰھاً غیری لا جعلنک من المسجونین (26/29)۔اگر تم نے میرے سوا اور کسی کو اپنا حاکم بنایا تو میں ضرور تمہیں قیدی بناؤں گا (موضح القرآن) یہاں قرآن کریم نے الٰہ کا لفظ ٹھیک حاکم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہی ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا ہے۔ مقصد محولہ بالا آیت کریمہ کا یہ ہے کہ اطاعت خالص اللہ تعالیٰ کی کی جائے کیوں کہ اس کا حکم ہے کہ ولا یشرك فی حکمہٖ احداً (18/26)۔وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا دخیل نہیں بناتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی مجرد ہے اور ہم سب کی آنکھوں سے اوجھل ہے اور ہمارا اس سے براہِ راست کوئی تعلق قائم نہیں ہوسکتا' اس لئے اس کی اطاعت کا عملی طریقہ اسی کی کتاب کی اطاعت اور اس کتاب کے مطابق نظام خداوندی جاری کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔ چنانچہ صدر اول میں یہی کچھ ہوا۔حضورﷺ نے کتاب خداوندی کے عطا کردہ نظام کو عملاً متشکل کیا کیونکہ ہر نظام کی اطاعت کے لئے ایک مرئی مرکز کی صورت لابدی اور ضروری ہے اور حضورﷺ نے ہی اس نظام کو جاری فرمایا تھا۔اس لئے ان کی اطاعت بطور نظام کے مرکز کی اطاعت کے ہوتی تھی۔اس کی عملاً صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام یا دین جس کو حضورﷺ نے اس دنیا میں متشکل کر کے دیا' اس کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ وہ نظام ہی واحد' تنہا اور اکیلا

ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تھا۔ یہی واحد ذریعہ ہے جس سے انسان اور اللہ تعالیٰ کا تعلق قائم رہتا ہے اور اس نظام کی ہر کڑی اور Hierarchy کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے' سڑک کے چوراہے پر کھڑا ہوا سپاہی جب آپ کو غلط روی سے روکتا ہے اور آپ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں تو آپ اس سپاہی کی ذاتی اطاعت نہیں کرتے بلکہ اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں جس کی طرف سے وہ متعین کردہ ہے اور جس نظام کا وہ نمائندہ ہے۔ اس مثال کو اوپر تک آئی۔ جی۔ پولیس اور گورنر تک لے جایئے۔ جو شخص گورنر کی اطاعت کرتا ہے وہ اصل میں اس مرکز حکومت اور اس نظام کی اطاعت کرتا ہے۔ اس مثال سے اس آیت کریمہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی (4/80)' اس آیت کریمہ اور Hierarchy کی وضاحت حضورﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمادی کہ من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی۔ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرانے کے لئے زندہ اتھارٹی اور ایک جاری شدہ متمکن نظام لازمی ولابدی چیز ہے اور یہ اطاعت کے لئے ایک Pre-requisite ہے۔ اس کے بغیر اطاعت خداوندی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ''سمع وطاعت'' کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ یعنی پہلے براہِ راست حکم کا سننا' اور پھر اس کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ ارشاد ہوا' اذقلتم سمعنا و اطعنا 5/7' جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اس کے بعد سورۂ نور میں ہے کہ جماعت مومنین کا یہ طریقہ ہے کہ جب انہیں ان کے کسی معاملہ میں حکم دینے کے لئے بلایا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ سمعنا و اطعنا 24/5' اس کے علاوہ ارشاد ہوا' یاایھا الذین آمنوا اطعیوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون 8/20۔ اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔ یہاں بھی اطاعت خداوندی کے لئے احکامات کا براہِ راست سننا شرط قرار دیا گیا ہے۔

یہ وہ نظام تھا جس کے ذریعے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی اور جو صدر اول میں حضورﷺ نے اور آپ کے اولالعزم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنی ان تھک محنتوں اور کوششوں سے قائم کیا تھا اور اس کے درخشندہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔ لیکن انسانیت کی بدقسمتی کہ یہ نظام زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا اور ملوکیت اور شہنشاہیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ نظام جلد ہی منقرض ہو گیا اور اس کے بعد ملوکیت و بادشاہت پوری پوری طرح غالب آ گئی اور دین کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ نظام تو ملوکیت کا قائم ہو گیا لیکن انسانیت کی بدنصیبی یہ ہوئی کہ اس پر ٹھپہ اور لیبل اسلام کا ہی لگتا رہا۔ ملوکیت کے غلبہ کے بعد دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اللہ و رسول کی اطاعت کا طریقہ بھی بدل گیا۔ دین میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے زندہ اتھارٹی کی موجودگی شرط تھی اور یہ

اطاعت بھی ایک ہی اطاعت تھی' اور اس کے لئے قرآن کریم نے بھی ہر جگہ واحد کا صیغہ ہی استعمال کیا ہے لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا اور زندہ اتھارٹی قائم نہیں رہی تو اللہ و رسول کی اطاعت کا طریقہ بھی تبدیل ہو گیا اور اب اللہ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول کی اطاعت احادیث کے ذریعے کی جانے لگی اور اطاعت رسول کا عملی مفہوم احادیثِ پر عمل کرنا قرار دیا جانے لگا۔

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے اعمال و افکار کو مسلمانوں کے بجائے اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم جسے تاریخ اسلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں اصل میں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہے اور یہ تاریخیں اڑھائی سو سال بعد تحریر میں آئیں جب کہ ان کے لئے پہلے سے تحریر کردہ کوئی مواد (Material) موجود نہیں تھا۔ یہ سقیفہ بنی ساعدہ سے لے کر' پورے بنی عباس کے دور تک خالص ملوکیت کے نکتہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں کیونکہ ہر آنے والی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار حاصل کرتی ہے' وہ سابقہ حکومت کی خامیوں اور کوتاہیوں کو خوب خوب اچھالتی ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں بھی چونکہ بنی امیہ کے بعد بنی عباس آئے جنہوں نے بنی امیہ سے بزور حکومت چھینی تھی اور ہمارا سارا لٹریچر بنی عباس کے دور کا تحریر کردہ ہے' اس لئے اس لٹریچر میں لازمی اور فطری بات تھی کہ بنی امیہ کو بری طرح Depict کیا جاتا۔ چنانچہ امیر معاویہ کا Role نہایت درجہ کا پست اور گھٹیا پیش کیا گیا ہے' اسی طرح جنگ صفین' جنگ نہروان' جنگ جمل کے واقعات اختراع کئے۔ حالانکہ قرآن کریم نے واضح طور پر ارشاد فرما دیا تھا کہ صحابہؓ آپس میں نہیں لڑیں گے 19/96 ,48/29۔ لیکن اس کے باوجود ہماری تاریخ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کو اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کو برسر پیکار دکھاتی ہے۔ جس میں ستر ہزار صحابہ قتل ہوئے اور حضرت زبیرؓ جو حضرت علیؓ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے وہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں ہی قتل ہوئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں یاللعجب۔ یہ سارے واقعات مسلمانوں کی تاریخ میں ہو سکتے ہیں' اسلامی تاریخ میں نہیں ہو سکتے کیونکہ قرآن کا واضح اعلان ہے کہ صحابہ کرامؓ آپس میں جدال وقتال نہیں کر سکتے۔

ملوکیت کے عہد میں یہی کچھ ہمارے عقائد کے ساتھ ہوا۔ چونکہ ملوکیت کو انسان کے مجبور محض ہونے اور تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہونے کا عقیدہ فائدہ دیتا تھا اس لئے اس عقیدہ کو خوب خوب فروغ دیا گیا۔ یہاں تک کہ دین کا اور کلمہ شریف کا جز بنا دیا گیا اور قرآن کریم کے بنیادی تصورات' صلوٰۃ' زکوٰۃ' تسبیح' سجدہ' تہجد' ملائکہ' شیطان' ابلیس' سب کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کے وہ معانی و مفاہیم اختیار کئے گئے جو ملوکیت کے حق میں تھے۔ چونکہ اس مضمون کا تعلق صرف اسلامی قانون اور اجتہاد سے ہے' اس لئے عقائد کی بحث سے تعارض نہیں کیا جاتا' وراس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ صرف یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ملوکیت نے نہ صرف قانون اسلامی کو متاثر کیا بلکہ اسلام کے بنیادی عقائد و تاریخ کو بھی متاثر کیا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے سلطنت و بادشاہی کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ یہ قطعاً اور مطلقاً حرام ہے۔ قرآن کریم کی رو سے خلافت کا حق کسی فرد واحد کو نہیں ہے۔ بلکہ پوری کی پوری امت اس میں شامل ہوتی ہے (3/110,22/78,24/55)۔ لیکن قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود' ظالم' جابر' فاسق' بدچلن' بادشاہ تلوار کے زور پر امت مسلمہ کی گردنوں پر سوار ہو گئے' ان ظالم بادشاہوں نے' کہ جن کے حرم میں بیک وقت کئی کئی سو کنیزیں ہوتی تھیں' خلافت کی بجائے اپنی بادشاہی اور ملوکیت قائم کر لی۔ اور جمہور مسلمانوں کا حق غصب کر کے اپنی بادشاہت کو مستقل طور پر قائم کر دیا۔ اس دور کے آئمہ کرام امام جعفر صادقؒ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ نے ملوکیت کی سخت مخالفت کی اور شدید مذمت کی۔ اگرچہ ملوکیت نے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان حضرات باوقار' کوہ تمثال نے تمام مصائب و آلام برداشت کئے لیکن ملوکیت وشہنشاہی کا ساتھ نہیں دیا۔ البتہ ان سے کم تر درجہ کے فقہا جو ان کے ہی شاگردوں میں شامل تھے انہوں نے ملوکیت کا ساتھ دیا اور اس طرح یہ قوانین' جنہیں اسلامی قوانین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مدون کئے گئے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان قوانین کا اسلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے تدوین کردہ قوانین ہیں اور بس۔ اور ان کا فقہ ملوکیت یا فقہ شاہی زیادہ مناسب نام ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام قوانین اور فقہا سے حاصل کردہ فتاویٰ' بادشاہوں نے اپنی حکومت چلانے کے لئے بنوائے تھے۔ اس دور میں جتنی بھی فقہ تیار ہوئی وہ سب بادشاہوں کو سپریم اتھارٹی تسلیم کرتے ہوئے مرتب ہوئی' جو کہ اسلام میں قطعاً حرام ہے فلہٰذا اس سارے قانون وفقہ کی بنیاد ہی خلاف قرآن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور اس دور کے فقہا زمین کی ملکیت کو بالکل حرام قرار دیتے تھے۔ لیکن ان بادشاہوں نے زمین کی ملکیت جائز قرار دی اور دوسرے درجہ کے فقہا سے اس کی تصویب حاصل کر لی۔ قرآن کریم کی رو سے اوقاف کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن ان قوانین میں اوقاف کے ادارے قائم کرنے کو جائز شمار کیا گیا۔ چنانچہ آج تمام مسلم ممالک میں اوقاف بھی ہیں اور وزارت ہائے اوقاف بھی قائم ہیں۔ ان قوانین میں عورتوں' بچوں' مزدوروں' کسانوں' اقلیتوں اور بین الاقوامی حقوق کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی۔

اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی حکومت اور مسلم حکومت میں فرق ہوتا ہے۔ جس ملک میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہ مسلم ملک کہلاتا ہے' لیکن اس کا یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ وہ ملک اسلامی بھی ہو۔ مثال کے طور پر آج ترکی مسلم ملک ضرور ہے کیونکہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لیکن وہ اسلامی ملک نہیں ہے۔ اسی طرح آج کل تمام مسلم ممالک کی کیفیت ہے۔ یہی صورتِ حال بنوعباس کے دور کی تھی کہ اس وقت وہ ممالک مسلم ممالک تھے لیکن ان کی حکومت اسلامی حکومت ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ ان کی حکومت بالکل اسی طرح غیر اسلامی تھی جس طرح آج ترکی کی حکومت ہے۔ غیر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اسلامی قوانین نہیں ہو سکتے۔ اسلامی قوانین صرف اسلامی

حکومت کے جاری کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ اگر آج بھارت کی حکومت یا فرانس کی حکومت کسی وجہ سے شراب پر پابندی جاری کر دے، تو اگرچہ شراب کی حرمت قرآن کریم کے نزدیک مسلم ہے لیکن یہ قانون اسلامی قانون نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر آج انگلش حکومت Homosexuality کو جرم قرار دے دے، اور اس کی ممانعت کا قانون جاری کر دے، تو وہ قانون اسلامی نہیں ہوگا۔ اگر آج ترکی حکومت جواء، سٹہ کو ممنوع کر دے تو یہ قانون اسلامی نہیں ہوگا۔ اگر امریکہ میں یا کسی دوسرے ملک میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا، یا زانی کی سزا سو کوڑے مقرر کر دی جائے تو یہ قوانین اگرچہ قرآن کریم کے تجویز کردہ ہیں، لیکن یہ اسلامی قوانین نہیں ہوں گے۔ غیر اسلامی حکومت کا جاری کردہ قانون اسلامی نہیں ہوسکتا۔ صرف اور صرف اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اسلامی ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔

سماجی ادارے ہوں یا عقاید و افکار ان کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں کرنا چاہئے تاکہ ان عوامل و محرکات کا سراغ مل سکے جو ان حقیقتوں کے ظہور کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے یہ سارا پس منظر قارئین کرام کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس پس منظر کے ملاحظہ فرمانے کے بعد اس تناظر میں مسئلہ اجتہاد پر غور فرمائیں کہ جو قوانین ہی غیر اسلامی حکومتوں کے مدون شدہ غیر اسلامی ہیں، اور جن کا زیادہ مناسب نام فقہ شاہی ہے ان میں اجتہاد کا کیا مقام ہوسکتا ہے؟ یہ تو سارے کا سارا فقہ ہی ملوکیت، جو کہ قطعاً حرام ہے، اس کے سائے میں تدوین کیا گیا ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس کے ماخذ ہی غیر قرآنی ہیں۔ جس قانون کے ماخذ ہی غیر قرآنی ہوں اس میں اجتہاد کا کیا مرتبہ ہوسکتا ہے؟ اس فقہ میں اجتہاد کرنے اور اس کو جاری کرنے کا لازمی نتیجہ بادشاہی اور ملوکیت کو دوبارہ ہمارے سروں پر مسلط کرنا ہے (Restore کرنا ہے)۔ عوام کو سارے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کرنا ہے۔ عورتوں کو خصوصاً Sub-human conditions میں رکھنا ہے اسی لئے جو قوانین ہی قرآن کے خلاف ہیں ان میں اجتہاد کیسا؟

ہم جن قوانین یعنی موجودہ فقہ میں اجتہاد کرنا چاہتے ہیں ان کی ساخت ہی یہ ہے کہ یہ سب دور ملوکیت کے تراشیدہ ہیں اور ملوکیت اور شاہنشاہیت کو ابدی حقیقت خیال کرتے ہیں۔ ان قوانین کی ساری جدوجہد یہ ہے کہ کسی طرح شاہی طرز حکومت کو اسلامی تعلیمات سے مخلوط کر دیا جائے تاکہ عام مسلمانوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ حکومت اسلامی اصولوں کے مطابق چلائی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس دھوکے اور فریب میں نہ صرف عوام مبتلا تھے بلکہ اس زمانہ کے علماء و دانشور بھی اس سے متاثر تھے۔ حجت الاسلام، امام غزالی کا جو درجہ ہمارے ہاں مسلم ہے اس کے مطابق وہ نہ صرف سرخیل علماء ہی تھے بلکہ سرتاج اہل عرفان بھی شمار ہوتے ہیں، یہاں ان کے مراتب پر تبصرہ کرنے کا کوئی محل نہیں ہے لیکن اظہار حقیقت کے لئے اتنا تحریر کرنا ضروری ہے کہ یہ بات صرف اہل علم ہی جانتے ہیں کہ امام غزالی نے اپنی ابتدائی نصف عمر جن نظریات کی اشاعت و ترویج میں گزاری باقی نصف عمر ان ہی نظریات کی تردید و تغلیط میں صرف کر دی۔ اس بات کا ثبوت اور کسی سے

لینے کی ضرورت نہیں۔ ان کی کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' اور ''تہافت'' خود اس کا بولتا ثبوت ہیں۔ یہ بات تو صرف ضمناً بطور جملہ معترضہ درمیان میں آ گئی تھی۔ امام غزالی تحریر فرماتے ہیں۔ ''سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ سلطانی سلطانوں کو خدا نے مرحمت کی ہے۔ لہٰذا ان کی اطاعت کرنی چاہئے' ان سے محبت کرنی چاہئے اور ان کا حکم ماننا چاہئے۔ سلاطین سے جھگڑا کرنا درست نہیں اور ان سے نفرت کرنا غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم'' نصیحت الملوک از امام غزالی صفحہ 44 مطبوعہ لندن 1964ء۔ اور یہ بات امام غزالی کے دور سے مخصوص نہیں ہے' آج تک ہم مسلمان اسی پندار میں گرفتار ہیں اور ان ہی مردہ لاشوں کو کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔

جو قوانین بنو عباس کے دور میں بنائے گئے تھے وہ اس وقت کے معاشرتی حالات کے مطابق تھے مگر موجودہ دور کے معاشرتی حالات ان حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا اس دور کے قوانین موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتے ہم مسلمانوں کی زندگی میں بے شمار تبدیلیاں آئیں۔ ہمارے معاشرتی رشتے بدلے' پیداوار کے طریقے بدلے' سماجی قدریں بدلیں' رسم و رواج بدلے' رہن سہن کے طریقے بدلے' سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز بدلا۔ قانون و ضابطے بدلے' علوم و فنون بدلے۔ نئی ٹیکنالوجی کی بے شمار ایجادات آئیں۔ ٹیلی فون' ٹی۔وی' ریڈیو' فرج' ایئر کنڈیشنر' کاریں' ریل' ہوائی جہاز' بجلی' سب چیزوں نے پوری زندگی بدل کے رکھ دی۔ ان تبدیلیوں کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور معاشرے کی تنظیم ان خطوط پر نہیں کی جا سکتی جو بنو عباس کے دور میں تھی۔ اس زمانہ کے بنائے ہوئے قوانین میں اتنی وسعت اور گنجائش ہی نہیں ہے کہ ان میں اجتہاد کیا جائے اور اگر ان خشک' جامد' بے جان' بنجر قوانین میں اجتہاد کیا بھی جائے تب بھی وہ اجتہاد کے باوجود اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اجتہاد کا مروجہ مفہوم' اس پر تبصرہ اور انتقاد پیش کرنے کے بعد اب اجتہاد کا قرآنی طریقہ پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی حکومت حضورﷺ نے خود مدینہ شریف میں قائم فرمائی اور

(1) جو احکام قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ آئے تھے اور جن کی جزئیات بھی قرآن نے بتا دی تھیں وہ حضورﷺ نے بجنسہٖ نافذ فرما دیئے۔

(2) البتہ جو اصول و قوانین قرآن کریم میں ایسے آئے کہ جن کی جزئیات کا تعین نہیں کیا گیا تھا ان کی جزئیات کا تعین حضورﷺ نے خود فرمایا۔ جن اصول اور قوانین کی جزئیات قرآن کریم نے مقرر نہیں فرمائی ان کی صورت یہ ہے کہ وہ کوئی نادانستہ طور پر نہیں چھوڑی گئیں بلکہ ان کو عمداً بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان جزئیات کو زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونا تھا۔ ہر اسلامی حکومت کے لئے اپنے دور کے مطابق ان جزئیات کا متعین کرنا لازمی و ضروری ہے۔ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے مطابق جزئیات کا تعین کرنا' اور حالات کے مطابق قوانین کا اطلاق کرنا' حکومت اسلامی کے

دیگر امور طے کرنا' اس کی داخلی اور خارجی پالیسی بنانا' قرآنی اجتہاد کہلاتا ہے۔ حضورﷺ کا دور تمدن و معاشرتی اعتبار سے سیدھا سادھا دور تھا اس لئے حضورﷺ کے دور کی متعین کردہ جزئیات بھی بہت تھوڑی تھیں۔ قرآن کریم کے اصول اور اس دور کے مطابق طے کردہ جزئیات' ان دونوں کے مجموعے کا نام شریعت اسلامی یا ضابطۂ قوانین خداوندی تھا۔ اور اس ضابطہ کی اطاعت' حکومت اسلامی کی اطاعت یعنی اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ ہر اسلامی حکومت کی طے کردہ جزئیات اس حکومت کی شریعت ہوتی ہے۔

حضورﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کا دور نہایت مختصر اور حضورﷺ کے دور سے بالکل متصل تھا۔ اس لئے ان کے دور میں جزئیات میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ البتہ حضرت عمرؓ کا دور نسبتاً طویل بھی تھا اور فتوحات کی وجہ سے اس میں نئے نئے حالات بھی درپیش آ رہے تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ کے دور مبارک میں زیادہ جزئیات کا تعین کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں ایک خلیفہ کے فیصلے کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں کافی فیصلے اسی طرح کے ہوئے۔ وہ اولیات عمرؓ کے نام سے مشہور ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے اولیات عمرؓ کی تعداد 40 شمار کی ہے۔ جو اتنے قلیل عرصہ میں کی گئیں۔ اور ان کو انہوں نے مندرج بھی کیا ہے۔ ہم بھی ان میں سے چند کو درج ذیل کرتے ہیں تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ جزئیات کا تعین اپنے اپنے دور کے مطابق ہوتا تھا اور یہی اس دور کا اجتہاد تھا۔

(1) قرآن کریم نے صدقات میں سے ایک حصہ مولفتہ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں کیا۔ حضورﷺ نے افرع بن جابس کو ایک مرتبہ تالیفِ قلب کے لئے سو اونٹ دیئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں انہوں نے کچھ اراضی بھی مانگی وہ بھی حضرت ابوبکرؓ نے ان کو دی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے' اپنے دور خلافت میں اس زمین کو واپس لے لیا اور یہ فرمایا کہ اب اسلام کا نظام مضبوط ہو گیا ہے اور اب اس کو تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے وہ زمین حضرت عمرؓ نے واپس لے کر دیگر مستحقین کو دے دی۔

(2) جس حاملہ عورت کا شوہر فوت ہو جائے' حضرت عمرؓ نے اس کی عدت کا عرصہ وضع حمل رکھا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کا حکم تھا کہ وضع حمل یا چار مہینے دس دن کی مدت میں سے جو مدت لمبی ہو گی وہی اس کی عدت ہو گی۔

(3) دادا کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دیتے تھے' لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(4) حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت' غلام کی بیوی ہو کر صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر حرام ہو جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں ہو گی۔

(5) حضرت ابوبکرؓ لوگوں پر برابر مال تقسیم کراتے تھے' اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح حضورﷺ کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی

حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے حضورﷺ کے خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو حضورﷺ کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو ختم کر دیا۔

اس قسم کے اور بہت واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ کی متعین کردہ جزئیات کو ناقابل تغیر و تبدل نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ ہر خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانے کے لئے شریعت ہوتا تھا۔ اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانے والوں کے لئے شریعت ہوتا تھا۔ اور یہی اس کا اجتہاد ہوتا تھا۔

جیسا کہ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہے اجتہاد کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ اجتہاد اسلامی حکومت کرتی ہے۔ فرداً فرداً اجتہاد نہیں ہوتا۔ قوانین میں انفرادی طور پر جو ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے وہ اجتہاد نہیں ہوتا بلکہ شاہی قوانین یا ملکی قوانین میں تبدیلی ہوتی ہے' اس کا اجتہاد سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

اجتہاد کی دوسری شرط یہ ہے کہ اسلامی قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے۔ ہمارے ہاں جو مسلمہ طور پر اسلامی قانون کے چار ماخذ' یعنی قرآن' حدیث' اجماع و قیاس شمار کئے جاتے ہیں تو یہ قرآن کے خلاف ہیں اور ان تین ماخذ کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (5/44)۔ دوسری آیت میں ہے کہ وہ فاسق ہیں (5/47)۔ اور ایک آیت میں ہے کہ وہ ظالم ہیں (5/45) ان آیات کریمات سے واضح ہے کہ قانون ما انزل اللہ کے مطابق بنایا جائے گا اور اگر کوئی قانون خالص ماانزل اللہ کے مطابق نہیں ہوگا تو وہ کفر' فسق اور ظلم پر مبنی ہو گا۔ ماانزل اللہ کے ساتھ نہ تو اپنی خواہشات کو شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دوسری چیز کو۔ جو شخص بھی ماانزل اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شامل کرے گا' وہ قرآن کریم کی خلاف ورزی کرے گا' یہ آیات کریمات' اور اسی قبیل کی متعدد آیات اس موضوع پر اتنی واضح اور بولتی ہوئی ہیں کہ علماء کرام کو اس بات کے تسلیم کرنے میں جائے مفر نہیں رہا اور وہ ہم سے اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ حکومتی فیصلہ صرف منزل من اللہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ ہم منزل من اللہ صرف قرآن کریم کو شمار کرتے ہیں جب کہ علماء کرام حدیث شریف کو بھی منزل من اللہ خیال فرماتے ہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حدیث منزل من اللہ نہیں ہے تو پھر کوئی شخص بھی اس کو ماخذ قانون بنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ''وحی صرف قرآن میں ہے اور خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے'' کے موضوع پر طلوع اسلام کے لٹریچر میں بے شمار مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔ کمترین راقم سطور کے بھی چھ مضامین' اسی عنوان سے' اس موضوع پر رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہو چکے ہیں' ان سب کا احصاء تو یہاں ممکن نہیں ہے جن حضرات کو احقاق حق کی جستجو ہو' اور اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ان مضامین کی طرف

مراجعت فرما سکتے ہیں۔ البتہ صرف دو آیات کریمات مقصد پیش نظر کے سلسلہ میں تحریر کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ منزل من اللہ صرف قرآن کریم ہے۔

(1) وانزلنا الیک الکتٰب بالحق مصدقاً لما بین یدیه من الکتٰب ومهیمناً علیه فاحکم بینهم بما انزل الله (5/48)۔ ہم نے تم پر برحق کتاب نازل کی' جو کتاب اس وقت موجود ہے' یہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان بھی ہے۔ تو جو کچھ تم پر خدا نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم بھی حکم دو۔ اس آیت کریمہ میں ماانزل اللہ کی وضاحت کتاب سے کر دی ہے کہ ماانزل اللہ کتاب ہے اور صرف اس کے مطابق فیصلے کرو۔

(2) والذین اتینهم الکتاب یفرحون بما انزل الیک (13/36)۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ تمہارے پاس نازل کئے گئے سے خوش ہوتے ہیں' اس جگہ پھر انزل الیک کی وضاحت کتاب سے کی ہے۔ کیونکہ یہ ترکیب میں ایک دوسرے کا بدل اور مبدل منہ' واقع ہوئے ہیں۔ ماانزل اللہ اور کتاب ایک ہی چیز ہے اور ماانزل اللہ میں حدیث شریف شامل نہیں ہے فلہٰذا کیونکہ صرف ماانزل اللہ ہی قانون کا ماخذ ہے' اس لئے حدیث بحیثیت ماخذ قانون کے اس سے خارج ہو گئی اور قانون اسلامی کا ماخذ صرف قرآن کریم ٹھہرا۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ حضورﷺ نے اپنے دور سعید میں قرآن کریم کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق' صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلے کئے اور اپنے حالات کے مطابق جزئیات کا تعین فرمایا۔ یہ حضورﷺ کا اجتہاد تھا۔ حضورﷺ کے انتقال کے بعد یہی حکومت آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کوئی Vacuum میں قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا تسلسل حضورﷺ کی حکومت سے تھا۔ اس لئے جب حضرت ابوبکرؓ کوئی فیصلہ فرماتے تو سابقہ حکومت کے طرز عمل (سنت) سے مستغنی نہیں ہو سکتے تھے۔ جب بھی کوئی حکومت تسلسل قائم رکھتی ہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے آنے والی حکومتوں میں مسلسل جاری رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ نئی حکومت' سابقہ حکومت کے فیصلوں کو رد کر دے۔ یہی صورتِ حال خلافت راشدہ میں ہوئی۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہی فرمایا کہ میں قرآن وسنت کا اتباع کروں گا۔ اس سے ان کی یہی مراد تھی کہ کوئی نئی حکومت قائم نہیں کروں گا بلکہ حکومت کا تسلسل قائم رکھوں گا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ میں سنتِ رسول اللہ اور سنت ابی بکر پر عمل کروں گا۔ اس طرح سنت قانون سازی کے سلسلہ کا ایک Process تھی۔ وہ بذاتِ خود ماخذ نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح قیاس سے کام لیا گیا اور خلافت راشدہ میں بہت سے امور پر اجماع ہوا۔ سنت کی طرح قیاس اور اجماع سے بھی قانون سازی میں مدد لی گئی۔ یہ خود قانون کے ماخذ نہیں تھے۔ ماخذ تو قانون بنانے کا صرف قرآن کریم تھا جو کہ منزل من اللہ ہے۔ باقی تینوں چیزیں قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں۔ قرآن کریم کے

مطابق کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہ جاری کرنا اتباع سنت ہے۔ نئے معاملات پر تدبر و تعقل کرنا اجتہاد یا قیاس ہوگا اور امت کے مشورے سے نتائج اخذ کرنا' اور انہیں جاری کرنا' اجماع ہے' ماخذ شریعت کا صرف قرآن کریم ہے۔

لیکن اب جبکہ ہمارا دور انحطاط ہے اور غور و فکر کا دروازہ بالکل بند ہے' تو یہی چاروں شقیں شریعت کا ماخذ قرار پا گئیں اور یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ گذشتہ علماء کرام و فقہائے عظام نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جو مسائل مستنبط کر لئے وہ آنے والے ہر دور کے لئے غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی ان آئمہ کرام کی تدوین کردہ کتب فقہ' قوانین شریعت کا ماخذ بن گئیں اور علماء کرام کے نزدیک جس طرح قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اسی طرح ان کتابوں میں درج شدہ فقہ' قرآن کی آخری تعبیر ہے۔ جس طرح قرآن کریم میں ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح فقہ میں بھی کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان اس فقہ سے جان نہیں چھڑائیں گے کبھی اس زوال و ادبار سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

یاد رہے کہ اگر امت مسلمہ تباہی کے اس بھنور سے نکلنا چاہتی ہے تو اسے دو اقدام ضرور لینے ہوں گے خواہ وہ کتنے ہی جرأت آزما کیوں نہ ہوں اس کے بغیر وہ تباہی سے نہیں نکل سکتے۔ اولاً تو اس فقہ کو فوری طور پر ترک کرنا ہوگا اور دوسرے ہمارے ہاں جو تفاسیر' تفسیر القرآن بالروایات کے طریقہ پر تحریر کی گئی ہیں' اور جن میں زیادہ تر نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں' ان کو چھوڑ کر تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر تفسیر تحریر کر کے' خالص قرآن کی تعلیم کو اختیار کرنا ہو گا۔ چونکہ تفسیر القرآن' اس مضمون کا موضوع نہیں ہے نیز یہ کہ اس سلسلہ میں بہت کثیر مواد تحریر شدہ موجود ہے' اس لئے صرف اس اشارہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اصل بات جو تلخ بھی ہے اور ناگوار بھی وہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی عزت' شہرت' مفادات' تکریم و تعظیم' حصول رزق کے ذرائع سب قدیم فقہ میں مہارت سے وابستہ ہیں اس لئے وہ اس قدیم فقہ میں تبدیلی کے قائل نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے اس رویہ سے قوم تباہ ہو رہی ہے' جس کی ذمہ داری ان علماء کرام پر ہی ہے اور اس طرح وہ پوری امتِ مسلمہ کو جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ

(قل) نار جهنم اشد حرا لو كانوا يفقهون (9/81)

(اے رسول کہدو کہ) جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے اگر وہ کچھ سمجھیں تو۔

وهٰهنا مناتم الكلام
على مصطفنا الوف سلام

(مفہوم) اور یہ وہ مقام ہے کہ یہاں ہمارا کلام ختم ہوا اور ہمارے حضور ﷺ پر ہزاروں سلام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

صفاتِ خداوندی کی ہمارے ساتھ رشتوں کی نوعیت

اللہ۔۔۔کل مذاہب کی مشترکہ میراث ہے۔یعنی ہر مذہبی شخص اللہ کو لازماً مانے گا۔ویسے دنیا میں ان گنت ایسے ''بے دین'' بھی مل جائیں گے جو اللہ کے ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔جی ہاں متعدد فلسفی' مفکر' سائنسدان اپنے اپنے علوم اور عمیق ذہنی احساس کے تحت بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس عظیم کائنات کا کوئی خالق و مالک ضرور ہے اور وہی بزرگ و برتر ہستی اس لامتناہی اور پیچیدہ نظام کو چلا رہی ہے۔پھر کائناتی قوتوں کی Inter Relationing اور Interaction کی جو حیران کن تفصیلات انہوں نے بیان کی ہیں' ان کا مشاہدہ عقل کو ایسے تحیر کے قلزم میں لے جاتا ہے جس کی تھاہ کا سراغ نہیں ملتا۔ایک خلیے پر مشتمل جاندار سے لے کر بنیولا کے ستاروں کے نور تک ہر شے عجیب جگمگاہٹوں میں ڈوبی ہوئی دکھائی ملے گی۔لیکن یہ طے ہے کہ ہر مظہر کی دید کے لئے قرآنِ فطرت کی تلاوت فرض ہے اور جنہوں نے اس پاکیزہ عمل کو اپنا معمول بنالیا' اکتشافات وانکشافات کی بارشوں نے ان کی روحوں کو سیراب کر دیا۔مطلب یہ کہ اللہ تک لے جانے والا ایک روٹ یہ بھی ہے۔باقی وہ شاہراہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے جو فرد کی ذات کو نشوونما دے کر اسے اس قابل بنا دیتی ہے کہ مثالی فلاحی و رفاہی معاشرے کی تشکیل کے لئے معاون ثابت ہو سکے۔اس منہاج پر گامزن ہونے کا افادی پہلو یہ ہے کہ ''سالک'' ''مجذوب'' ہونے سے بچ جاتا ہے۔یعنی وہ ستاروں پہ کمند ضرور ڈالتا ہے لیکن اس کے پاؤں ارضیات سے اپنے ناتے منقطع نہیں کرتے۔وہ ایک آئیڈیل سماج میں زندگی بسر کرتا ہے جہاں کوئی خوف ہوتا ہے نہ حزن۔سلامتی اور تحفظ کے احساسات کے ساتھ جینے کا اپنا لطف ہے۔عبادات سے لذت کشید کرنے کا اپنا سرور ہے۔رشتوں کی پہچان اور ان سے استفادے میں قدرت نے جو ذائقے پنہاں رکھے ہیں ان کی دریافت کے عمل کے کیا کہنے۔پھر نعمتوں کے پھولوں سے لدی سواری میں سوار ہو کر اکوان وعوالم سے ہوتے ہوئے الٰہیات کی ثغور وشیون پہ جا دستک دینے میں جو مزا ہے بس کیا عرض کریں۔

دوستو! ایک دستک ایک در ہی وا کر سکتی ہے اور انسان کتنی ہی دستکوں پر دسترس حاصل کر لے' سارے دروہ نہیں کھول سکتا' کبھی نہیں کھلوا سکتا کہ بہرحال حدگی ہوئی ہے۔ایک مقام پر پہنچ کر ہر کسی کے پر جلنے لگتے ہیں۔اور ہماری نگاہ میں یہی جانکاری ذوقِ پرواز کی سب سے بڑی محرک ہے۔ہماری دانست میں ہر در پر اللہ کے صفتی نام کی تختی (Name Plate) آویزاں ہے۔ویسے گہرائی میں جا کر دیکھیں تو اللہ

کے متعلق یہ تصور کہ وہ ہر صفت سے بے نیاز ہے کوئی گمراہ کن Doctrine نہیں کہ امر واقعہ تو یہی ہے کہ وہ کسی صفت میں بہرطور Reduce نہیں ہوسکتا بلا شبہ اس کی شان پاک ہے ہر محدودیت سے۔ لیکن یہ اس کی محبت' عطوفت اور کمال مہربانی ہے کہ وہ 'اسماءالحسنٰی' کی وساطت سے اپنے بندوں کے قلوب کے آنگنوں میں اترتا ہے۔ بس اس نے چاہتوں کو زندہ رکھنے کے لئے' رابطوں کو بحال رکھنے کے لئے صرف اور صرف اپنے بندوں کی خاطر بعض صفات کو ''اپنالیا''۔ اب اس کی مرضی یہ ہے کہ میرا بندہ میری صفات کو اپنا کر میرے رنگ میں رنگین ہو جائے۔ صاحبو! پھر مزید گہرا غور ہمیں اسی نتیجے پر پہنچائے گا کہ وہ ایسا محبّ ہے جس نے اپنے محبوب بلکہ محبوبین کے لئے مختلف شیڈز کے پیرہن تیار کروائے ہیں اور اس کی خوشی بس اتنی ہے کہ اس کی مخلوق اس کے تیار کردہ ملبوسات کو پہن پہن کر اس کے سامنے آتی رہے اور یوں اپنے ہاتھوں سے تخلیق کئے ہوئے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر وہ مسرور ومحظوظ ہوتا رہے کیونکہ جس نے پہننا ہے وہ بھی اس کی تخلیق ہے جو رنگ وہ پہنے گا وہ بھی اس کے دستِ قدرت کا شاہکار ہے' یوں اس کا حظ سوا ہو جائے گا یہ دیکھ کر کہ میرے اس بندے پر (میرا) یہ رنگ کتنا جچ رہا ہے۔ یہ ہے اس کی جمال دوستی اور جمال آفرینی۔

اچھا ایک بات بڑی ہی اہم بات کہ اللہ نے ایک حد تک اپنی صفات کو ''مشروط'' رکھا ہے۔ بلا شبہ اس کی رضا اسی میں ہے کہ بندہ اپنے رنگ کے موافق اپنے لئے رنگ چنے اور وہی رنگ جو خلق کرنے والے نے اس کے لئے بنایا ہے مگر اس کے باوصف اگر بندہ ہٹ دھرمی سے کام لیتا ہے تو وہ اسے روکتا نہیں' مجبور نہیں کرتا' یوں بندہ اپنے بھدے پن اور کور ذوقی سے ان لوگوں کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے جنہوں نے Matching اور Contrast میں نفیس انتخاب کا ثبوت دیا ہوتا ہے۔ جی حسن انتخاب ہی تو رضائے ربانی کا دوسرا نام ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ خدا کی صفات (Attributes) کی فہرست کہاں تک ہے؟ نہیں وہ ننانوے یا نوسو ننانوے تک محدود نہیں۔ یہ حساب وشمار انسان کے بس کی بات نہیں' انسان صرف پابند ہے تو اس بات کا کہ اسے صفتِ ربانی کو جذب کرنے کیلئے اپنی اہلیت ثابت کرنا ہو گی۔ خدا بے شک رحیم و رازق ہے اور وہ بڑے پیار سے مطالبہ کرتا ہے کہ میرے بندے بھی صفاتِ رازقیت ورحیمیت کو اپنائیں۔ ظاہر ہے ان صفات کو جو بھی اپنائے گا اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہی اپنائے گا۔ اس طرح ''شرک'' کے داغ سے بندے کا دامن آلودہ ہونے سے محفوظ رہے گا۔ وگرنہ خدا کی رازقیت خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے' اس کی خاص رحیمیت کا علاقہ وہی جانتا ہے مگر بندوں کے ظروف یکساں نہیں ہیں' بڑھے' آگے بڑھے' ہر کوئی آگے بڑھے لیکن کوئی کتنا بھی آگے بڑھ جائے جس طرح اللہ ایک دم' معاً اپنی رازقیت اور رزاقیت کو نافذ کرسکتا ہے' بندہ تو نہیں کرسکتا۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے خدا کی صفتِ رحیمیت کا نقش قبول کیا تھا' وہاں تک کوئی کیا پہنچے گا لیکن ان کی پیروی میں اس جادے پر قدم تو رکھا جا سکتا ہے۔ بس اتنا یاد رہے خدا کی رحمت کے سمندر کا

ساحل تو نہیں تلاش کیا جا سکتا لیکن رحمت اس کو ملے گی جو اس کا اہل ہوگا۔ یعنی اپنی بے پایاں رحمت اس نے اپنے بندوں کے لئے ''لکھ دی'' ہوئی ہے لیکن تقویٰ کی شرط کے ساتھ اور تقویٰ اختیاری عمل ہے ورنہ اس کی رحمت اگر بے ضابطہ ہو تو دکھ پہنچانے والے بندوں کو بھی اسی طرح رحمت ملے۔ اس مسئلے کا عطر قرآنِ مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے' ذرا غور کیجئے ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کے راستہ میں جہاد کیا وہی رحمتِ خداوندی کی امید کر سکتے ہیں اور اللہ غفور الرحیم ہے''۔ فضل کے مستحق بھی یہی لوگ ہیں' انعام کے حقدار بھی اسی قبیلے کے افراد ہیں۔ آخر میں ایک باریک نکتہ کہ فضل و انعام و رحمت اگر صرف حقداروں کے لئے مختص نہ ہوتا اور نیز نافرمانوں کے لئے اللہ' قہار و جبار نہ ہوتا۔ اس کے قوانین سے سرکشی اختیار کرنے والے بھی اگر اس کے انتقام سے بچ جاتے۔ مفسدین بھی اگر کرم کے سزاوار ہوتے تو ایسے رب کو رحیم و کریم تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جی ہاں اس زاویے کو لطیف طبائع ہی جان پائیں گی کہ قاتل کے لئے جو اللہ شدید العقاب ہے درحقیقت اس قاتل اور اس کے مقتول کے لئے وہی اللہ مہربان' حلیم اور رؤف ہے۔ اس تناظر میں یہ جہت بھی سمجھ آ سکتی ہے کہ اللہ کی صفت دوسری صفت کی ضد نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باغبان خواتین وحضرات کی خدمت میں

کھلا خط

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

باغبان ایسوسی ایشن سست رفتاری سے لیکن انتہائی مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھ رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں دیہات کی سب سے مؤثر غیر سیاسی تنظیم کے طور پر ابھر کر چھا جائے گی۔ بڑے بڑے اہل علم وعمل باغبان اس میں شامل ہو کر اس کو قابل توجہ اور پرکشش بنا دیں گے ہمارے ماٹو کے دو حصے ہیں۔ ''قرآن فہمی اور باغبانی'' جن سے پاکستان کا کوئی شہری اختلاف نہیں کر سکتا۔ یہی وہ جذب دروں ہے جس کی وجہ سے آج تک کوئی باغبان ممبر بن جانے کے بعد نہ صرف کہ اعلانیہ الگ نہیں ہوا بلکہ اس نے مزید دوستوں کو یہ راہ دکھائی۔ 20 تاحیات ممبران کا تعلق مری۔ کوٹلی سیتاں۔ جہلم اور لاہور سے ہے۔ تمام پاکستانی باغبانوں سے استدعا ہے کہ وہ اس تحریک باغبانی میں شامل ہو کر غذا اور موحولیات سے دوستی کا پورا پورا حق ادا کریں۔ تاحیات ممبرشپ کا چندہ -/100 روپے ہے۔

2005ء کو نوجوانوں کا سال قرار دیا گیا ہے۔

ہماری تجویز ہے کہ 2006ء کو باغبانی کا سال قرار دیا جائے۔ ہم جلسۂ عام میں بھی بذریعہ ریزولیوشن نمبر 24 حکومت پاکستان اور باغبانوں سے اس بارے میں تعاون کی اپیل کریں گے۔ خدا کرے محکمہ زراعت خوابِ غفلت سے جاگے اور وہ بھی اپنا حق ادا کرے۔

باغبان ایسوسی ایشن کی رکنیت پوری دنیا میں سب سے آسان ہے۔ کوئی سے دس پھلدار پودہ جات کی فہرست۔ شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ اور دو روپے سالانہ چندہ دے کر ممبر بن جائیں۔ پتہ رابطہ:

(۱) ملک حنیف وجدآنی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری۔

(۲) صبینہ یاسمین، سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں۔ سوہاوہ۔ جہلم۔

(۳) ڈاکٹر صلاح الدین اکبر (تاحیات) ممبر باغبان ایسوسی ایشن، 33 سی، گلبرگ 3، لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی فِکر کا پرتو اَخبارات وجرائد میں

خوانندگانِ کرام! خوشبو کے آگے کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی روشنی کے آگے کوئی فصیل رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے۔ قرآنی فکر کی جس شمع کو طلوع اسلام کم وبیش نصف صدی سے روشن کئے ہوئے ہے' ہزارہا مخالفتوں کے جھکڑوں' صد ہزارہا منفی پراپیگنڈوں کی آندھیوں کے باوجود اپنی بساط بھر' روشنی بکھیرنے میں مصروف ہے اور خوشبوئیں بانٹ کر امتِ مسلمہ (بالخصوص) اور عالم انسانیت (بالعموم) کے مشامِ فکر کو معطر کرتا چلا آرہا ہے۔ کیا اس کی یہ مساعی جمیلہ نامشکور وصدا بصحرا ثابت ہوئیں' کیا اس کی یہ دل سوزی وآرزومندی بیکار گئی؟ نہیں! بالکل نہیں! آج آپ ذرائع ابلاغ کی طرف سرسری توجہ فرمانے سے واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ اس فکر کا' قرآنی فکر کا پرتو کس قدر نمایاں ہے۔ آپ چراغوں کی قطاریں دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

ذیل میں ہم چند ایک اخبارات وجرائد میں سے معروف کالم نویسوں اور دانشوروں کے رُشحات قلم کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کررہے ہیں۔ امید ہے پسندِ خاطر آئے گا۔

(سلیم اختر)

یہ عمرے قانوناً بند کیجئے

غیر سیاسی باتیں.....عبدالقادر حسن

پاکستان کے خوشحال لوگ ان دنوں عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ ایک خبر ہے کہ اس سال عمرہ کا ویزا لگوانے والوں کی تعداد دو لاکھ سے بڑھ گئی ہے جبکہ حج پر جانے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہوتی ہے۔ میرے ایک اندازے کے مطابق ایک شخص کے عمرے کا خرچہ ایک لاکھ روپے کے قریب ہوتا ہے۔ چالیس ہزار کا تو ٹکٹ ہی ہے۔ سعودی عرب میں ان دنوں رہائش دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگی ہو جاتی ہے اور پاکستانی شاپنگ سے بھی باز نہیں آتے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو صرف خانہ کعبہ کے طواف اور رسول پاک ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری کے لئے ہی جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی کسر دوسرے خوشحال پاکستانی نکال دیتے ہیں جو ایک

لاکھ سے زیادہ اخراجات کر دیتے ہیں۔ ان اخراجات میں آدھے سے زیادہ کے اخراجات فارن ایکسچینج میں ہوتے ہیں جس کی ہمارے وزیراعظم جمع وزیرخزانہ جناب شوکت عزیز کو سخت ضرورت ہے۔ اس طرح ہم ایک نفلی عبادت پر کروڑوں اربوں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ اسلام میں زندگی میں ایک دفعہ حج فرض ہے اور وہ بھی صاحب استطاعت اور صحت مند لوگوں پر۔ اس کی چند دوسری شرائط بھی ہیں لیکن عمرہ کسی پر فرض نہیں ہے لیکن گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ عمرہ بھی ایک اسٹیٹس سمبل بن گیا ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ پاکستان کے اندر کتنے خاندان نہایت ہی فقر و فاقہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور چند ہزار روپوں کے انتظار میں کتنی بچیاں شادی کے انتظار میں عمر بڑھ جانے کے قریب ہیں۔ میں ایک بار عمرہ پر گیا تو واپسی پر اس کا ذکر کر دیا۔ کئی قارئین نے یہ سوال پوچھا کہ تم نے عمرے پر جو خرچ کیا ہے کیا اس سے کسی مفلس پاکستانی خاندان کی مدد نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بچی کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان دنوں بھوک کی وجہ سے خودکشیاں نہیں ہوتی تھیں اس لئے کسی نے اس کا ذکر نہ کیا۔ میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے عمرے پر آئندہ نہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ گزشتہ دنوں بلکہ ایک عرصہ سے جدہ میں مقیم محترم میاں صاحبان کی طرف سے بارہا عمرہ کی دعوت ملی جواب تو ناراضگی تک بھی پہنچ رہی ہے لیکن میں معذرت ہی کرتا رہا حالانکہ میں ان دونوں بھائیوں سے اداس بھی ہوں مگر اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ میں سوچتا ہوں اور شاید بہت سے قارئین مجھ سے اتفاق بھی کر لیں کہ اگر ملک میں اسلام کے کچھ قریب کوئی حکومت ہوتی جس کے اپنے اخراجات کسی حد کے اندر ہوتے اور وہ اخلاقاً قوم سے بچت کی بات کرنے کی مجاز ہوتی تو میں اس سے عرض کرتا کہ وہ عمرہ پر مکمل پابندی عائد کر دے اور حج کی زندگی میں صرف ایک بار اجازت دے جو فرض کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔ یہ روز روز کے عمرے کسی ایسی قوم کو ہرگز زیب نہیں دیتے جو بھوکوں مر رہی ہو۔ بدقسمتی سے ہم نے ایک نمائشی اسلام اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے جس کا اسلام کی حقیقی روح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کا سبق حاصل کرنے کے لئے ہم جن لوگوں کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں اور جن کی زندگیوں سے سبق حاصل کرتے ہیں ان کے ہاں ہمیں کسی پاکستانی اسٹائل کے اسلام کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ جو حکمران کندھے پر سامان خور و نوش اٹھا کر کسی معذور مسلمان کے گھر جا کر اپنے ہاتھ سے اس کا کھانا تیار کرتا ہو کیا وہ برداشت کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کے کسی ملک میں مسلمان تو بھوکے ننگے ہوں اور اس کے کچھ لوگ عمروں پر کروڑوں روپے خرچ کرتے پھریں۔ حیرت ہوتی ہے ایسے لوگوں کے مضبوط دلوں پر جو اپنے اڑوس پڑوس سے بےخبر اور لاتعلق ہو کر ایک ایسی عبادت پر اتنے زیادہ اخراجات کر دیتے ہیں جو واجب بھی نہیں اور اگر میں مفتی ہوتا تو یہ فتویٰ دیتا کہ ان لوگوں کی یہ عبادت قابل قبول نہیں ہے بلکہ اپنے گھر میں، اپنے ملک میں، اپنی قوم میں ناداروں، بیماروں اور محتاجوں کو چھوڑ کو جو لوگ عمروں پر جاتے ہیں وہ قابل تعزیر ہیں۔ ان سے اس کی

باز پرس ہونی چاہئے۔ اسلامی ریاست ایک ویلفیئر اسٹیٹ کا نام ہے جس میں شہریوں کے بنیادی حقوق ادا کئے جاتے ہیں اور روٹی' کپڑا' مکان کی فراہمی ایک ویلفیئر اسٹیٹ کی پہلی شرط ہے مگر ہماری یہ کیسی اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے جس میں اسلامی فلاح و بہبود کے تصور کا نام ونشان نہیں ہے اور جو ایک بُرے سرمایہ داری نظام کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ جس ملک کے حکمرانوں کی حفاظت پر کروڑوں یا شاید اربوں خرچ ہوتے ہوں اس ملک اور قوم کو باقی رہنے کا کتنا حق ہے یہ کسی ماہر سیاسیات کو واضح کرنا چاہئے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور)

☆☆☆

سیکولر اسلامی جمہوریہ پاکستان

روزنِ دیوار سے.....عطاء الحق قاسمی

گزشتہ ہفتے ایک محفل مذاکرہ میں پاکستان اور تحریک پاکستان کے حوالے سے ایک بہت مفید گفتگو سننے کو ملی۔ شرکائے گفتگو کا تعلق مختلف مکاتبِ فکر سے تھا۔ ان میں سے ایک صحافی اور ڈاکٹر مہدی حسن کے نقطہ ہائے نظر میں اگرچہ اختلاف تھا لیکن اس بات پر یہ دونوں دانشور متفق تھے کہ روشن خیالی اور اعتدال پسندی ہی میں پاکستان اور پاکستانی عوام کی فلاح پوشیدہ ہے۔ تاہم ڈاکٹر مہدی حسن اس بات کے حامی تھے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست قرار دیا جائے کہ پاکستان کی بقا اور استحکام اسی میں ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن کا کہنا تھا کہ مذہبی انتہا پسندی نے ہمارے معاشرے کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور ہم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے چنانچہ سیکولر ازم ہی ہماری بقا کا واحد راستہ ہے!

ڈاکٹر مہدی حسن کی اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں کہ مذہبی انتہا پسندی ہماری قوم کے سفینے میں بھاری پتھروں کی طرح ہے جس کی وجہ سے کشتی ڈولنا شروع ہوگئی ہے۔ اگر ہماری زندگیوں میں مذہب اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ ہوتا یعنی ہمارے قول وفعل میں تضاد نہ ہوتا' ملا کی اذان مجاہد کی اذان سے مختلف نہ ہوتی' ہم قرآنی تعلیمات کے مطابق جستجو اور تحقیق کے جویا ہوتے اور یوں نئے علوم وفنون میں سب سے آگے آگے ہوتے تو یہ ''انتہا پسندی'' ہمارے لئے رحمت ہوتی مگر ہم قرآن سے صرف تعویذ گنڈے کا کام لیتے ہیں۔ ہمارا عمل' عملیات اور وظائف تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ ہم اللہ ہو اللہ ہو بھی کرتے رہتے ہیں اور کرپشن میں بھی مشغول نظر آتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایک طرف انتہائی مذہبی اور دوسری طرف انتہائی کرپٹ ہے۔ ہم مذہب کو گناہوں کے چورن کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ہماری ساری بحثیں فروعی نوعیت کی ہیں۔ مسلم ٹی وی چینلوں اور غیر مسلم ٹی وی چینلوں سے نشر ہونے والے مذہبی پروگراموں کا موازنہ کر کے دیکھ لیں، ہمارے چینلوں کے مذہبی پروگراموں میں صرف فقہی قسم کے مسائل کے حوالے سے باتیں ہوتی ہیں۔ انتقال خون جائز ہے کہ نہیں؟ اعضاء کی ٹرانسپلانٹیشن اسلام کی رو سے کیسی ہے؟ فلم بینی کے متعلق علماء کا کیا خیال ہے؟ موسیقی حلال ہے یا حرام؟ تصویر کشی کے حوالے سے اسلام کا نقطہ نظر کیا

ہے؟ اور مفتی صاحبان کے نزدیک ان میں سے بیشتر چیزیں حرام قرار پاتی ہیں۔ بہت سے سوالات طہارت وغیرہ کے متعلق بھی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف مسیحی اور ہندو چینلوں کے مذہبی پروگراموں میں اس قسم کے سوالات نہیں پوچھے جاتے اور نہ ان موضوعات پر کوئی بات کی جاتی ہے بلکہ وہ مذہب کا تصور وسیع تناظر سے پیش کرتے ہیں۔ اقبال کی ساری شاعری عجمی اسلام کی تباہ کاریوں کے حوالے سے ہے جس کی مکمل تفسیر ہمارا ''مذہبی'' معاشرہ پیش کرتا ہے۔ قائداعظم بھی جو پاکستان چاہتے تھے اور جو اسلام انہیں عزیز تھا وہ یہ اسلام نہیں تھا بلکہ ان کے ذہن میں ایک ایسی اسلامی ریاست کا تصور تھا جو جدید دور کے تقاضوں سے متصادم نہیں ہے۔ ہم نے پاکستان کو ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' تو قرار دے دیا ہے لیکن یہ نہ تو ''اسلامی'' ہے اور نہ ''جمہوریہ'' ہے بلکہ ہمارے ہاں اسلام اور جمہوریت دونوں کی مسخ شدہ شکلیں نافذ ہیں۔ اسلام کے نام پر بے گناہوں کو قتل کر دیا جاتا ہے' رائے کے اختلاف کو الحاد کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر عورتوں کے حقوق غصب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام کا حوالہ وہاں ہی دیا جاتا ہے جہاں اس حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے دور زوال میں دو مسیحی اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ بائبل کی رو سے گھوڑے کے منہ میں کتنے دانت ہوتے ہیں؟ قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے کہا ''بائبل کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ سیدھی طرح گھوڑے کا منہ کھول کر اس کے دانت گن لو!'' ہم بھی گھوڑے کا منہ کھول کر اس کے دانت گننے کی بجائے لوگوں کو فروعی قسم کے مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ہمارے ذہن بڑی سوچ سے عاری ہو گئے ہیں۔ ہمارے سروں پر خود ساختہ عقائد کے کلبوت چڑھا دیئے گئے ہیں جس کے نتیجے میں سر چھوٹے اور منہ بڑے ہو گئے ہیں اور یوں پوری قوم دولے شاہ کا چوہا بنتی چلی جا رہی ہے۔

ان حالات میں اگر ڈاکٹر مہدی حسن پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کی بات کرتے ہیں تو یہ اتنی ناقابل فہم نہیں۔ واضح رہے سیکولر کا مطلب بے دین یا لادین نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد رواداری' تحمل اور ایک دوسرے کے عقائد اور طرز زندگی کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر مہدی حسن کے ذہن میں بھی سیکولرازم کا یہی مفہوم ہو گا تاہم میرے خیال میں ''سیکولر'' کے ساتھ ''اسلامی'' کا لفظ بھی ضروری ہے تاکہ ہمارے سیکولرازم کی علیحدہ شناخت ہو سکے۔ اسلام کا حوالہ اس ضمن میں یوں ضروری ہے کہ پاکستان اور اسلام کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں اگرچہ ہم نے انہیں ظالم ومظلوم بنا کر رکھ دیا ہے۔

میں جانتا ہوں میرے کچھ دوست اسلامی سیکولرازم کی اصطلاح کو پسند نہیں کریں گے وہ کہیں گے کہ اسلام کے اندر سیکولرازم یعنی رواداری' تحمل اور برداشت پہلے سے موجود ہے پھر اس کے ساتھ سیکولر کا دم چھلا لگانے کی کیا ضرورت

1. قاسمی صاحب اپنے لطیف اسلوب میں بات کر رہے ہیں لیکن سیکولرازم کو بطور اصطلاح لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی سرکار جس کا کوئی مذہب نہ ہو۔ پاکستان تو ایک نظریاتی مملکت کے طور پر وجود میں آیا تھا جس کا مطمع نظر اسلام کا بطور دین نفاذ تھا جو بدقسمتی سے ابھی تک خواب وخیال ہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی مثالی مملکت میں ہر ایک کو بلاتفریق مذہب بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے۔ (سلیم)

ہے؟ یہ چیز بالکل اسی طرح ضروری ہے جس طرح اخبارات و جرائد میں چھپنے والے مضامین' کالموں اور خبروں کی سرخی نکالی جاتی ہے حالانکہ سرخی نکالنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ سرخی میں جو بات کہی گئی ہوتی ہے وہ مضمون' کالم اور خبر کے متن میں موجود ہوتی ہے مگر سرخی کا مقصد متن کے خصوصی پہلو کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اسلام کے متن میں سے سیکولرازم کی سرخی نکالنا ضروری ہو گیا ہے تاکہ ہم باہر کی دنیا کو یہ پیغام دے سکیں کہ اسلام کوئی پرتشدد مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ''لا اکراہ فی الدین'' کا پرچارک ہے 1۔ اگر اسلام کے مختلف فرقوں سے وابستہ مسلمان اپنے دینی رویوں کو واضح کرنے کے لئے دیوبندی مسلمان' بریلوی مسلمان' اہل حدیث مسلمان اور شیعہ مسلمان کہلا سکتے ہیں' اگر اسلام نافذ کرنے کی دعویدار جماعتیں کسی ایک نام کی بجائے جماعت اسلامی' جمعیت علماء اسلام' جمعیت علمائے پاکستان اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے علیحدہ بینر لگا سکتی ہیں' اگر ایک ہی منشور کی حامل مختلف سیاسی جماعتیں مختلف ناموں سے کام کر سکتی ہیں اور ان سب کا بنیادی مقصد اسلام اور پاکستان کی خدمت ہے مگر وہ علیحدہ ناموں سے ان مخصوص پہلوؤں کو اجاگر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان کے نزدیک اسلام اور پاکستان کی خدمت کے ضمن میں سب سے زیادہ اہم ہیں تو پھر اس وقت پاکستان اور اسلام کی بھی سب سے بڑی ضرورت ''سیکولر اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے۔ اگر.....؟

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور)

☆☆☆

ایک بنیادی مسئلہ

تکبیر مسلسل.....خورشید ندیم

اس ملک میں خیر کے بہت سے ایسے کام جاری ہیں جن کی ذمہ داری سول سوسائٹی نے اٹھا رکھی ہے۔ مساجد اور مزاروں کی تعمیر اور تزئین و آرائش کے علاوہ معاشرے کے محروم طبقات کے لئے تعلیم' روزگار اور رزق کے بے شمار منصوبے ہیں جو کسی حکومتی تائید کے بغیر جاری ہیں اور اس کے لئے تمام وسائل غیر حکومتی ذرائع سے فراہم ہو رہے ہیں۔ اگر یہ سروے درست ہے کہ اس ملک میں سالانہ ستر ارب روپے صدقات و خیرات کے نام پر اس معاشرے سے جمع ہوتے ہیں تو یہ سارا سرمایہ انہی مصارف کے لئے وقف ہے۔

ان کاموں کی ضرورت اور اہمیت مسلمہ ہے۔ دینی مدارس اس مذہبی روایت کے امین ہیں جو صدیوں سے جاری ہے اور وہ ہمارے علمی ورثے کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ان مدارس کے تعلیمی و تربیتی نظام کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن ان اداروں کی ضرورت فی نفسہٖ موجود ہے۔ اسی طرح ہر معاشرے کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ وہ محروم طبقات کی ضروریات کا خیال رکھے اور اپنے وسائل سے ان کی محرومیوں کی تلافی کرے۔ اصولی طور پر اس مقدمے کو درست سمجھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ ہمیں اس حوالے سے اپنے خیالات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک اس باب میں بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم جو رقم فی سبیل اللہ یا معاشرے کی بھلائی کے لئے خرچ

کرتے ہیں اس کے لئے صحیح ترتیب کیا ہے۔ کیا ہمیں چند مخصوص مقامات کو اپنی ترجیح قرار دینا چاہئے یا ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ آج ہمارے معاشرے کی ضرورت کیا ہے اور اس اعتبار سے اپنی ترجیحات متعین کرنی چاہئیں۔ میں وضاحت کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں کچھ عرصہ پہلے میں راولپنڈی کے ایک یتیم خانے میں گیا۔ میرے ساتھ ایک دوست تھا جسے بکرا صدقے میں دینا تھا۔ یتیم خانے میں موجود ذمہ دار آدمی نے ہمیں توجہ دلائی کہ یہاں روزانہ اتنے بکرے آتے ہیں جو یہاں کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ یتیم بچوں پر خرچ کرنا چاہتے ہیں تو ان کی بے شمار دوسری ضروریات ہیں آپ ان کے لئے رقم دے دیجئے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس طرف اکثر لوگوں کی توجہ دلاتے ہیں لیکن اس کا زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ لوگوں کے اس اصرار کے پس منظر میں یہ تصور موجود ہے کہ صدقے کا تعلق خون بہنے سے ہے اور اس کی یہی شکل موزوں ہے۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسجدوں اور مزاروں کی تعمیر و آرائش کی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سال پہلے اگر مسجد کا ایک مینار تھا تو آج دو ہو گئے ہیں کسی مزار پر رنگین ٹائلیں نہیں تھیں تو آج وہ بھی لگ گئی ہیں۔ مسجدوں کا قیام اور آبادی مسلمان معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کی حد کیا ہے۔ اگر ایک محلے کی آبادی پانچ سو ہے تو وہاں کتنی مساجد کی ضرورت ہوگی ظاہر ہے کہ اس کا تعین ہونا چاہئے۔

اسی طرح غیر ضروری میناروں اور آرائش پر خرچ ہونے والی رقم کیا اس کا صحیح استعمال ہے؟ اس سوال پر بھی غور ہونا چاہئے۔ اب ہر سال عمرے پر ہم جو رقم خرچ کرتے ہیں اس کے بارے میں میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ یہ اللہ کی رضا کے حصول کا کیا صحیح طریقہ ہے۔ مجھے ایک ذمہ دار/ آدمی نے بتایا کہ راولپنڈی کے ایک پیر نے اس سال رمضان میں پی آئی اے سے چھ چارٹر طیاروں کا مطالبہ کیا۔ اسلام آباد کے نواح میں آباد ایک معروف پیر ہر سال مریدوں کے ساتھ ایک چارٹر طیارے پر عمرے کے لئے جاتے ہیں۔ کیا ان لوگوں نے کبھی اس سوال پر غور کیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا یہی مطلب ہے یا کوئی اور؟

یہ آج معاشرے کے اہل دانش اور اہل مذہب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اہل خیر کو بتائیں کہ آج ہماری معاشرتی ضروریات کیا ہیں اور ہمیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کیا ترجیحات قائم کرنی چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ آج معاشرے کے ایک اہم مسئلے کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ گئی ہے جو ان ترجیحات میں پہلے یا دوسرے نمبر پر ہونی چاہئے۔ یہ مسئلہ ہے معاشرے کی فکری تشکیل نو جسے (Social Reformation) کہا جاتا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہمارے مذہبی خیالات کی اصلاح ہو ہمارے سماجی رویوں کی تربیت ہو اور زندگی سے متعلق ہمارے تصورات بدلیں۔ بدقسمتی سے جو لوگ اس کی ضرورت سمجھتے

ہیں' انہوں نے کبھی اس معاشرے کے اہل خیر کو اس جانب متوجہ نہیں کیا کہ وہ ایسے اداروں کی سرپرستی کریں آج ملک میں ان مقاصد کے لئے جو غیر سرکاری ادارے کام کر رہے ہیں وہ بڑی حد تک غیر ملکی اداروں کی (Donations) پر چل رہے ہیں۔ اب اس بارے میں بجا طور پر اس خدشے کا اظہار ہوتا ہے کہ ڈونر اداروں کا اپنا ایجنڈا ہوتا ہے اور اس سے گریز کرنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ ملک کے مخیّر حضرات اگر اس کام کی ضرورت کو نہ سمجھیں اور ایسے ادارے باہر سے بھی مدد نہ لیں تو پھر یہ کام کیسے ہوگا۔ پچھلے ماہ ملائیشیا کے ایک ممتاز سکالر اور انسانی حقوق کے لئے متحرک ڈاکٹر چندرا مظفر' آرگنائزیشن فار ریسرچ اینڈ ایجوکیشن (ORE) کی دعوت پر ملک کے مختلف شہروں میں لیکچرز کے لئے تشریف لائے انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی NGO جو (Just International) کے نام سے عالمی سطح پر انصاف کے لئے متحرک ہے وہ کسی غیر ملکی ادارے سے مدد نہیں لیتی۔ اس کا انحصار داخلی وسائل پر ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ملائیشیا کی کم از کم چار وزارتیں ایسی ہیں جو اپنے سالانہ بجٹ میں ان غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے لئے رقم مختص کرتی ہیں اور پھر معاشرہ بھی بھرپور تعاون کرتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں کئی ایسے تحقیقی ادارے ہیں جو عہد حاضر میں دین کی تعبیر و تشریح کا عظیم الشان کام کر رہے ہیں اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہیں کہ ضروریات کے لئے ان کا تمام تر انحصار داخلی وسائل پر ہوگا لیکن معاشرہ ان کی ضروریات کے مطابق ابھی تعاون نہیں کر رہا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگ اس ضرورت کو سمجھتے ہیں اور ان کے تعاون سے ایسے ادارے قائم ہیں لیکن اگر ستر ارب روپے میں سے ایک یا دو فیصد بھی اس کام پر خرچ ہوں تو معاشرے کی فکری ساخت یکسر تبدیل ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ آج اس سوال پر سب سے پہلے گفتگو ہونی چاہئے کہ ہماری معاشرتی ضروریات کیا ہیں' ان میں ترجیحات کا تعین کیسے ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا صحیح میدان کیا ہے؟

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور)

☆☆☆

پاکستانی معاشرہ اور بعض الفاظ کا غلط مفہوم

عزیز احمد مغل

جنگ سنڈے میگزین 21 نومبر کے شمارے میں ڈاکٹر شاہد مسعود خٹک کا آرٹیکل بعنوان ''پاکستانی معاشرہ ایک سماجی و نفسیاتی جائزہ'' شائع ہوا ہے۔ ایک جگہ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ''پاکستانی معاشرے میں مذہب کا ایک پرفریب استعمال اہل اقتدار اور قومی وسائل اور آسائشوں پر قابض طبقے نے یوں کیا ہے کہ انہوں نے درباری علماء و مشائخ و گدی نشینوں کے ذریعے عام مسلمان کو یہ باور کرایا ہے کہ مذہب فقط تقدیر پر اس طرح راضی ہونے کا نام ہے کہ جو جس کے پاس ہے وہ عطیہ خداوندی ہے اور انہیں مال اور اقتدار اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے اور ان سے محروم طبقات کو اس پر راضی بہ رضا ہونا چاہئے اس طرح معاشرے میں قناعت' توکل اور صبر و رضا کے نام پر لوگوں میں کاہلی' بے ہمتی اور بزدلی کا عفریت مسلط

کر دیا گیا''۔

صحیح صورتحال یوں ہے کہ ہمارے ہاں صبر' شکر' توکل اور رضا کا مفہوم غلط مروج ہے۔ ہمارے ہاں صبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان بے کس اور بے بس' مجبور بن کر بیٹھا رہے۔ زبردست اور ظالم کے ظلم و زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بے چارگی میں کہتے ہیں کہ ''اچھا جو تمہارے جی میں آئے کرلو' میں صبر کے سوا کیا کرسکتا ہوں'' اور اسی صبر کی تلقین یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ ''میاں! صبر کرو صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے''۔ یعنی صبر انتہائی بے چارگی کا نام ہے۔

جبکہ صبر کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا لہٰذا اس کے بنیادی معنوں میں استقامت' ثابت قدمی اور مسلسل کوشش داخل ہے۔ ان اللہ مع الصابرین کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں۔ **اصبروا** کے معنی ہیں' ہمت اور استقلال سے اپنے موقف پر قائم رہنا اور صابروا کے معنی ہیں اس استقلال اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنا یا دوسروں کے مقابلے میں استقامت دکھانا یا ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بننا۔

ہمارے ہاں ''صابر و شاکر'' کا مفہوم بالکل الٹ ہے ''شکر'' کے معنی ہیں کسی چیز کا بھرا ہوا ہونا اور مقدار میں کثیر ہونا بھی ہیں۔ ''شکر'' کے بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے ''سعی مشکور'' کا مطلب سمجھ میں آ جائے گا یعنی ایسی کوشش جس کے بھرپور نتائج سامنے آ جائیں۔ چونکہ ''شکر'' کے معنی نمایاں اور ظاہر کرنا ہیں اس لئے اس کے مقابلہ میں ''کفر'' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ڈھانپ کے رکھنا اور دبا دینا ہیں۔

مساعی کے مشکور ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان میں بھرپور نتائج پیدا ہو جائیں وہ پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو جائیں۔

انسان کی طرف سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کرے یعنی وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کرے اور کائنات میں پھیلے ہوئے سامان نشوونما کو نوع انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھے ان پر پردے نہ ڈالے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنوں میں تھوڑی چیز پر اکتفا کر لینا بھی ہیں چنانچہ ''فرس شکور'' اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسے فربہی کی بنا پر تھوڑا سا چارہ بھی کافی ہو جاتا ہو۔ صلاحیتوں کے نشوونما پا جانے سے خود بخود یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑے سے خارجی سہارے بھی بھرپور نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں صبر' شکر' قناعت' رضا اور توکل کا جو مفہوم مروج ہے اس کا دین اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور)

☆☆☆

مکافاتِ عمل

کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے

عمران جاوید رانا

دین کا دارومدار خدا کے قانون' مکافاتِ عمل پر ہے۔ دین کا مدار ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کا مدار۔ مکافاتِ عمل کے معنی ہیں کہ ''ہر کام اپنا متعین نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے''۔ خارجی کائنات کی ہر شے قانون خداوندی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ اسی لئے وہاں ہر حرکت کا متعین نتیجہ ازخود مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے اس لئے یہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق بھی زندگی بسر کرتا ہے اور ان کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے۔ جب وہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور خلاف ورزی کا نتیجہ تخریبی ہوتا ہے یعنی اس کی ذات پستیوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس قسم کے افراد ہوں گے اسی قسم کا معاشرہ تشکیل پائے گا لہٰذا معاشرہ کا دارومدار بھی قانون مکافاتِ عمل پر ہوگا یعنی کائنات کی کوئی شے یا نظام اس قانون کے احاطہ سے باہر نہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہی قانون مکافات' افراد کی طرح اقوام میں بھی عمل پیرا رہتا ہے۔ صحیح روش پر چلنے والی قوم کو عروج اور ترقی حاصل ہوتی ہے جبکہ غلط روش پر گامزن' زوال و ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتی ہے۔

اعمال کے نتائج واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں اور جو یہاں سامنے نہیں آتے وہ مرنے کے بعد ظہور پذیر ہوں گے۔ حیات آخرت کا منکر یہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ کسی طرح سے اس دنیا میں اپنے غلط کردار کے تباہ کن نتائج سے اپنے آپ کو بچالے تو پھر اسے کسی قسم کا خوف وخطرہ نہیں۔ لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی اس دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مرنے کے بعد آگے چلتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کا جو قانون طبعی دنیا میں کارفرما ہے اسی قسم کا قانون انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ اس کے لئے بھی اس نے کچھ قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان مستقل اقدار کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے اس کی ذات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے (اسے اس قانون شکنی کی سزا کہہ لیجئے) اگر وہ شخص ان مستقل اقدار کی خلاف ورزی ترک کر دے تو اس کی ذات میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس تخریب کا مقابلہ کر سکے جو پہلی غلط روش سے پیدا ہوگئی تھی۔ یوں قانون مکافات انسانی دنیا میں کارفرما رہتا ہے۔

قرآنی مجید' فرقان حمید میں مکافات کا لفظ نہیں آیا بلکہ اس میں ''اعمال کی جزا'' یا اجر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں خود لفظ دین کے ایک بنیادی معنی بھی اعمال کا بدلہ ہیں۔ الفاظ کوئی بھی ہوں مطلب ان سے ہے کہ خدا کے قانون علت و معلول کے مطابق انسان کا ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ انسان کو اس چیز کا تو اختیار ہے کہ وہ جونسا عمل چاہے اختیار کرے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ جو کام کرے اس کا نتیجہ بدل دے۔ مثلاً اسے اس بات کا اختیار تو ہے کہ وہ مصری

کا ٹکڑا منہ میں ڈالے یا زہر کی پڑیا لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ کھائے تو زہر مگر اس کا نتیجہ مصری کا پیدا کرے۔

مکافات عمل کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ایک شخص نہایت دیانتدار اور پاکباز ہے لیکن غلط معاشرہ میں لوگوں کی سازشوں کی وجہ سے اسے مصیبتوں میں پھنسا دیا جاتا ہے ظاہر ہے اس وجہ سے اسے بہت سا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ اذیت اور نقصان اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ غلط معاشرہ کی روش کا نتیجہ ہے۔ اس باب کے حوالہ سے ہم نقصان کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کی طبعی زندگی سے ہے مثلاً جسمانی اذیت' مالی نقصان حتیٰ کہ جان تک کا اتلاف۔ غلط معاشرہ میں اس قسم کے نقصانات ہر شخص کو پہنچ سکتے ہیں۔ بلاتخصیص اس امر کے کہ وہ شخص مستقل اقدار کا پابند ہے یا نہیں۔ نقصان کی دوسری قسم وہ ہے جہاں سے انسانی ذات کو ضعف پہنچتا ہے۔ یہ نقصان کوئی شخص کسی دوسرے انسان کو نہیں پہنچا سکتا۔ اس قسم کا نقصان فرد متعلقہ خود اپنے آپ کو پہنچاتا ہے اور خود اس کا ازالہ بھی کر سکتا ہے۔

انسان کو اس امر کی احتیاط کرنی چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ یعنی احتیاط تو اس امر کی بھی کرنا چاہئے کہ انسان کو طبعی نقصان بھی نہ پہنچے لیکن دوسری قسم کے نقصان سے جس سے محفوظ رہنے کے لئے احتیاط نہایت ضروری ہے۔

معاشرہ کیسا ہی غلط رو کیوں نہ ہو' انسان کو اقدار' روایات کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرنی چاہئے۔ انسان کو کوشش کرنا چاہئے کہ معاشرہ' اقدار خداوندی کے مطابق متشکل ہو جائے تاکہ کسی کو ناحق طبعی نقصان نہ پہنچے اور فرد کو اپنی ذات کے تحفظ کے لئے آسانیاں میسر آ جائیں۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور)

☆☆☆

نظام الصلوٰۃ کی ضرورت

غلام باری (مانچسٹر)

صوبہ سرحد کی حکومت نے نماز کے اوقات پر کاروبار بند رکھنے کا قانون پاس یا نافذ کیا ہے۔ نظام الصلوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری طرح نماز تو انگریز کے دور حکومت میں بھی پڑھی جاتی تھی اور پاکستان بنانے میں قائداعظمؒ کی مخالفت میں نیشنلسٹ علماء کے گٹھ جوڑ سے ہندو بھی نماز کی اجازت کا وعدہ دیتے تھے۔ اسی لئے مفکر قرآن علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

محض نماز کی ادائیگی سے زندگی اسلامی نہیں بن جاتی' اسلامی زندگی اسلامی نظام کے تابع ہی ممکن ہے جس سے اعراض برتتے ہوئے 57 سالوں سے ہم گریز کی راہیں نکالتے چلے آ رہے ہیں نتیجہ سب کے سامنے اور قرآنی اصول کے مطابق ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ کا ارشاد ہے کہ جو فرد یا قوم ہمارے قوانین سے اعراض برتے گی اس کی معیشت (روزی) تنگ ہو جائے گی اور یومِ قیامت اسے اندھا اٹھایا جائے گا۔ قرآن

کریم پر ایمان کے باوجود اس میں دیئے گئے خدا کے نظامِ ربوبیت کو پسِ پشت ڈال کر ہم غربت دور کرنے کے فارمولے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

مذہبی پیشوا اور اللہ کے ارشادات

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ اپنے عہد معاہدہ' قول قرار کو' جن کی پابندی کی تاکید قانون خداوندی اس شدت سے کرتا ہے' دنیاوی مفاد کی خاطر بیچ ڈالتے ہیں' انہیں مفاد عاجلہ تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا اور یہ ظاہر ہے کہ اس دنیا کا فائدہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مستقبل کے مقابلہ میں اس کی کچھ قیمت نہیں ہو سکتی۔ مستقبل کی خوشگواریوں کے سلسلہ میں قانون خداوندی ایسے لوگوں سے بات تک نہیں کرے گا۔ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ان خوشگواریوں میں حصہ نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی صلاحیتیں دب کر رہ جائیں گی۔ ان کی ذات کی نشوونما نہیں ہو گی اور اس طرح یہ درد انگیز عذاب مبتلا ہو جائیں گے۔ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی طرف سے باتیں وضع کرتے ہیں اور پھر انہیں وحی خداوندی کے ساتھ اس طرح بٹ دیتے ہیں کہ وہ دونوں مل کر ایک ہی نظر آئیں اور یوں انسانوں کی باتیں خدا کی شریعت بن جائیں۔ جب ان سے پوچھو تو پوری دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ باتیں بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں' حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ اس طرح یہ لوگ دیدہ و دانستہ خدا کے خلاف جھوٹ بولتے ہیں اور افترا پردازی کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ لوگوں سے اپنی باتیں منوائیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائیں (قرآن)۔ لوگ اتنا نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ خودساختہ شریعت اور اس کے ذریعے کمائی ہوئی دولت ان کے لئے سراسر تباہی اور بربادی کا موجب ہے (قرآن)۔

(بشکریہ جنگ' لندن)

آمد مہدی ونزول عیسیٰ علیہ السلام

جو کچھ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے اسے اس کے صحیح مقام پر رکھ کر دیکھئے' اس کا نتیجہ ہدایت' شرف و مجد' خوش گواریاں و کامرانیاں و سربلندیاں ہو گا' لیکن اگر اسے اس کے مقام سے ہٹا کر اپنے خودساختہ معتقدات ونظریات اور مسالک کے تابع رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ گمراہی' ذلت و رسوائی' تباہی و بربادی اور انحطاط و زوال ہو گا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے اور جس شے کا قرآن میں ذکر ہی نہ ہو' اسے زیب داستاں کے لئے سینہ سے لگائے لگائے پھرنے کا نتیجہ ظاہر ہے سوائے سراب کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جاؤ' تمہاری سماعت' بصارت اور عقل ہر ایک سے سوال کیا جائے گا''۔ (القرآن)۔ انسان اپنے تجربے' مشاہدے' غور و فکر اور عقل سے علم حاصل کرتا ہے یعنی یہ علم اس کو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لئے اس علم کو ادراک بالحواس کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک علم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا تھا' جس میں یہ علم حاصل کرنے والوں کے خیالات و قیاسات اور جذبات کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا

تھا۔ اس علم کو وحی خداوندی کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم عطا کیا جاتا تھا وہ رسول یا نبی کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ: ''وہی عالم الغیب ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا' مگر جس رسول کو پسند فرمائے''۔ (القرآن)۔ ''خدا ایسا بھی نہیں کرتا کہ تمہیں غیب کی باتیں بتا دے مگر وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے لئے چن لیتا ہے''۔ (القرآن) رسول کریم ﷺ سے کہا گیا کہ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو تیری طرف وحی کی گئی''۔ (القرآن) سنت اللہ یہی ہے جس کی رو سے دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی طرح حضور اکرم ﷺ کے پاس بھی علم حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے تھے' ایک تو ان کی عقل سلیم و بصیرت انسانی اور دوسرے وحی الٰہی جو صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے''۔ (القرآن)۔ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد ازاں پہنچے' زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں''۔ (القرآن) اور آپ سے کہلوایا گیا کہ: ''کیا تمہارے لئے قرآن ہی کافی نہیں ہے''۔ (القرآن) گذشتہ و آئندہ کے جن واقعات کا علم حضور اکرم ﷺ کو دیا گیا وہ وحی کے ذریعے دیا گیا اور انکا ذکر قرآن میں آ گیا ہے۔ وحی الٰہی یعنی قرآن کریم کے علاوہ آپ ﷺ کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے آپ کو آئندہ کے واقعات کا علم ہوتا۔ رسول کریم ﷺ قرآن کے علاوہ کسی قسم کے غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔ چوں کہ امام مہدی اور نزول عیسیٰؑ کا ذکر قرآن میں نہیں ہے' لہٰذا یہ عقیدہ یا نظریہ قرآن کے خلاف' وضعی روایات پر مبنی' اسرائیلیات اور عیسائیت سے مستعار لیا ہوا ہے اس لئے آمد مہدی اور نزولِ عیسیٰؑ جیسے خلاف قرآن نظریات کو چھوڑنا ہماری آنے والی نسلوں کے لئے بہتر ہوگا۔

(بشکریہ جنگ' لندن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر مسلموں کی پوزیشن قرآنی مملکت میں

اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کے افراد نہیں تسلیم کئے جا سکتے، اس لئے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام ان انسانوں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے۔ یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلالحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر غور و فکر کریں، اور اس کے بعد اگر، علیٰ وجہ البصیرت اور بطیبِ خاطر (یعنی دل و دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کے لئے قابل قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں (شروع ہی میں یا جب جی چاہے) اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوگا۔

لا اکراہ فی الدین۔ (2/256)

اس سے قرآن نے، اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریک کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔ (73/19) ''جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔'' اس ''اذنِ عام'' کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے فیصلہ کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس سے اگر وہ کسی قسم کے گھاٹے میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ۔۔۔ خود کردہ را علاجے نیست۔۔۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو حقوق حاصل ہیں، ان میں برابر کا شریک ہو جائے۔ اگر اس کے انکار سے اسے کچھ خسارہ ہوتا ہے تو اسے اس خسارہ کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس انکار سے اس نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں، اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ ہمیں اس کا افسوس ضرور ہوگا، لیکن اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں، اس کا ازالہ کر لیں۔ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابل اعتراض سمجھا جاتا اور اسے ''تنگ نظری'' پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو، ان لوگوں کو کبھی شریک حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔

اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیے کہ اس مملکت میں اسلامی آئیڈیالوجی کو تسلیم کرنے والوں کو جو نسبتاً چند حقوق زائد حاصل ہوتے ہیں ان کے بالمقابل ان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور غیر مسلم ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ اس مملکت کے مسلم باشندوں پر تو یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں' خواہ اس کے لئے انہیں اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑے۔ یہ ان کے جہاد کا حصہ ہوگا اور غیر مسلم جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ ان کی جان' مال' عزت' عبادت گاہیں سب محفوظ ہوں گی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسن سلوک کیا جائے گا۔ (60/8) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائے گا۔ (5/8)۔

ان تمام مراعات کے باوجود' اگر یہ غیر مسلم ترک وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے:

وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلم الله ثم ابلغه مامنه۔ ذالك بانهم قوم لا يعلمون۔ (9/6)۔

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دے دو' یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآن کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی۔ (5/33-34)۔ یہ سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے۔۔۔ لہٰذا' اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ:

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم' امور مملکت میں شریک نہیں کئے جاسکیں گے' کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوق انسانیت حاصل ہوں گے۔ ان کی جان' مال' آبرو' پرستش گاہیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں شخصی مذہبی آزادی ہوگی۔ عدل وانصاف کے ضمن میں' ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہ اگر ترک وطن کرنا چاہیں گے تو اس کے لئے انہیں ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ نیز یہ کہ

مملکت کے تمام باشندوں کو (بلالحاظ مذہب' نسل' زبان' رنگ وغیرہ) وہ تمام بنیادی حقوق انسانیت حاصل ہوں گے جو آئندہ شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔ ان حقوق کو منسوخ یا معطل نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کو اس باب میں کوئی شکایت ہوگی تو اسے حق حاصل ہوگا کہ اس کے ازالہ کے لئے وہ عدالت کی طرف رجوع کرے۔ اس کے اس حق کو کسی صورت میں بھی سلب نہیں کیا جائے گا۔

(طلوع اسلام متذکرہ بنیادی انسانی حقوق کی فہرست آئندہ اشاعت میں شائع کرے گا)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شبیر احمد۔ ایم۔ ڈی (فلوریڈا)

ہدیۂ عقیدت

ہے زباں قاصر مری جذبات کے اظہار سے
میں نے جو پایا سو پایا آپؐ کے دربار سے

(شبیر)

صاحبو! ہم اس عنوان کے تحت عظیم غیر مسلم سکالروں کا خراجِ عقیدت بارگاہِ رسالتؐ مآب میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اور یہ دوسری قسط ہے۔

☆☆☆

۔۔۔۔میرے خیال میں تاریخِ عالم کے عظیم ترین لیڈر محمد ﷺ تھے۔ تاجدارِ ریاست، دینی راہنما، عظیم سپہ سالار۔ تینوں خوبیاں ان میں یکتا انداز سے جمع ہوگئی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام جیسا عظیم پیغمبر بھی اس معاملے میں ان سے پیچھے نظر آتا ہے۔

(جولز میسرمین، اوور ہسٹریز گریٹ لیڈرز)

☆☆☆

۔۔۔۔ایک مختصر سی زندگی میں محمد ﷺ نے ناقابلِ یقین کام کر دکھایا۔ ایک قوم تھی بکھری ہوئی جو کبھی یکجا نہ ہوئی تھی۔ ایک ملک تھا جس کی اہمیت زمین کے ٹکڑے سے زیادہ نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس قوم اور جغرافیے میں ایسا دین نافذ کر دیا جس نے مسیحیت اور یہودیت کو گہنا دیا۔ بکھرے ہوئے اور لڑتے ہوئے عربوں کو جوڑ کر ایک ایسی سلطنت قائم کی جو آناً فاناً تہذیب یافتہ دنیا کی دور افتادہ سرحدوں کو چھونے لگی۔

(فلپ کے ہٹی، ہسٹری آف دی عربز)

☆☆☆

۔۔۔۔محمد ﷺ ان چند خوش بخت انسانوں میں تھے جو اپنے دل سے سچائی کا چشمہ رواں کرتے ہیں اور اس میں خوشیوں اور کامرانیوں کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ایک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔ یہ حقیقت انہوں نے آخری سانس تک فراموش نہ کی کہ ان کا پیغام انسانیت کے لئے کتنا حیات بخش ہے۔ وہ اپنی قوم کو نہایت وقار کے ساتھ بشارتیں دیتے جو ان کے ضمیر سے روشن کرنوں کی طرح پھوٹتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتہا درجے کی حلیم اور انکسار پسند شخصیت تھے۔

(سٹینلے لین پول، سٹڈیز ان اے موسک (مسجد))

☆☆☆

۔۔۔۔محمد ﷺ کی زندگی، پورا کیریئر ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ خدا پر زبردست ایمان اور ان دیکھی دنیا پر ان کا غیر

متزلزل یقین انہیں غیر معمولی قوتِ ارادی بخشتا تھا۔ انہیں ہمیشہ ایک ایسی شخصیت کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا جنہوں نے بنی نوعِ انسان پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ایمان ہو یا اخلاقیات روزمرہ زندگی میں وہ ایک عظیم ترین آدمی سے کم نظر ہی نہیں آتے۔ یہ ان ہی کا جذبۂ صادق ہے جو زمانے کے ہر دور میں پھلتا پھولتا رہے گا۔

(روڈویل اپنے ترجمۂ قرآن کی تمہید میں)

☆☆☆

۔۔۔۔کتابِ فطرت سے محمد ﷺ نے اتنا کچھ پڑھا اور جذب کیا تھا کہ وہ ان پڑھ ہوتے ہوئے اپنے ذہین ترین دشمنوں پر کسی بھی اختلافِ رائے میں غالب رہتے تھے۔ ان میں فصاحت تھی' وقار اور نفاست کے ساتھ۔ اتنی بلند قامت شخصیت' جلال و جمال کا زبردست مظہر۔ یہ انسان اپنے شیریں کلام اور نرم گوئی سے لوگوں کے دل موہ لیتا تھا۔ انہیں بارگاہ خداوندی سے ایک خاص تحفہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ گویا ان کے گرد اتھارٹی اور جینیئس کا ایک ہالہ تھا۔ بڑے بڑے عالم اور معمولی ان پڑھ لوگ ان کے ارشادات سے یکساں متاثر ہوتے تھے۔

(چارلس سٹوارٹ ملز' ہسٹری آف محمدن ازم)

☆☆☆

۔۔۔۔یہ محمد ﷺ ہی کا جینیئس تھا کہ انہوں نے عربوں میں اسلام کی ایسی روح پھونکی جس نے صحرانشینوں کو بلند درجوں پر فائز کر دیا۔ عرب اپنی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو پہچاننے لگے۔ نچلے درجے کی قبائلی زندگی سے اٹھ کر وہ ایک متحد قوم اور پھر ایک بڑی سلطنت کے مالک بن گئے۔ ان کا پیغام سادہ تھا۔ ایک خدا کی پرستش اور محکومی جو بندوں کو بے شمار آقاؤں سے آزاد کرتی تھی۔ آپ ﷺ نہ کبھی خود مخمور ہوئے اور نہ وہ معاشرہ جس میں آپ نے روح پھونکی تھی۔ پیغام سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ خالص' پاکیزہ اور حد درجے قوی تھا۔ ایک خدا پر ایمان سے جو بھی عقیدے وابستہ ہوئے وہ اس قوم کی اخلاقیات اور ذہنی نشوونما کا ذریعہ بن گئے۔ ہر فرد میں ایک ایسی مقناطیسیت پیدا ہوگئی گویا وہ خود چلتا پھرتا قرآن ہے۔

(آرتھر گلن لیونارڈ' اسلام' ہر مورل اینڈ سپریچول ویلیوز)

☆☆☆

۔۔۔۔تاریخ میں کسی انسان نے دانستہ یا نادانستہ اپنے لئے اتنا بلند ارفع و اعلیٰ مقصد چنا ہی نہیں جتنا عرب کے اس مقدس پیغمبر نے۔ ان کا مقصد سپر ہیومن تھا۔ وہم و گمان کی تمام زنجیروں کو توڑ دینا جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان جکڑ دی گئی تھیں۔ خدا کو آدمی کے قریب اور آدمی کو خدا کے قریب لے جانا۔ عقل کی کسوٹی پر پورا اترنے والا عقیدہ جو سچے خدا اور جھوٹے خداؤں میں صاف تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں ایک انسان نے اتنا عظیم کام اپنے شانوں پر نہیں لیا جو بظاہر تمام امکانات سے زیادہ بھاری تھا اور پھر انہوں نے یہ عظیم کارنامہ بہت محدود وسائل کے ساتھ کر دکھایا۔ انقلابِ عظیم! وسائل کیا تھے؟ بس آپ کی اپنی ہستی اور مٹھی بھر صحرانشین۔ تاریخ عالم میں کسی بھی انسان نے اتنا زبردست اور پائیدار انقلاب پیدا نہیں کیا۔ دو صدیاں بھی نہ گزری تھیں کہ اسلام نے ایمان کی قوت سے پورے عرب کو زیرنگیں کر لیا۔ اس کے علاوہ سلطنت فارس' سلطنت روما' ہندوستان' شام' مصر' ایتھوپیا' پورا شمالی افریقہ' سپین' فرانس کا کافی حصہ'

درمیان کے سینکڑوں جزیرے اسلام کے پرچم تلے ایمان کی برکتوں سے فیضیاب ہونے لگے۔

مقصد کی عظمت' وسائل کی کمیابی اور حیران کن نتائج! انسانی جینیئس کو پرکھنے کے لئے اگر یہ تین معیار نگاہ میں رکھے جائیں تو بتایئے کوئی ہے جو کسی بھی عظیم شخصیت کا محمد ﷺ سے موازنہ بھی کر سکے؟ مشہور ترین لوگوں نے اسلحہ' قوانین اور سلطنتیں بنائیں۔ ان لوگوں نے صرف مادی قوتیں جمع کیں جو اکثر ان کے دیکھتے دیکھتے ریت کی ڈھیری کی طرح بیٹھ گئیں۔ محمد ﷺ نے فوجیں ہی نہیں چلائیں بلکہ دلوں کو گرما دیا۔ انہوں نے قانون سازی کی۔ سلطنتوں کی بنیاد رکھی جو آگے بڑھتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس دور کی آباد ایک تہائی دنیا میں کیا۔ اس سے بھی آگے بڑھیئے انہوں نے انسانوں کی بنائی ہوئی قربان گاہوں' دیوی دیوتاؤں' مذاہب غلط عقائد' جھوٹے تخیلات اور روحوں کو بدل ڈالا۔

ایک مقدس کتاب کی بنیاد پر جس کا ہر لفظ قانون بن گیا انہوں نے ایک ایسی روحانی قومیت تشکیل دی جس میں ہر رنگ و نسل اور زبان کے لوگ بھائی بھائی ہو گئے۔ انہوں نے اس روحانی اتحاد یا مسلم امہ کے دلوں میں خدائے واحد کی اطاعت اور باطل خداؤں سے بیزاری کا انمٹ جذبہ پیدا کر دیا۔ خدائی بادشاہت زمین پر لانے کی ایسی محبت ان کے ماننے والوں میں پیدا ہوئی کہ عقل سوچتی رہ جاتی ہے آیا یہ ایک انسانی معجزہ تھا یا عقل و حکمت کی فتح تھی!

ایک بلند پایہ مفکر' خطیب' پیغمبر' قانون ساز' فلسفوں کا فاتح' حکیمانہ عقائد پیش کرنے والا' بیس زمینی سلطنتوں کا بانی سب ایک روحانی سلطنت کے تلے۔ یہ ہیں محمد ﷺ! انسان کی عظمت کو جانچنے کے جتنے پیمانے ہو سکتے ہیں وہ سب لے آؤ اور پھر خود سے پوچھو۔ کیا آپ ﷺ سے بڑا انسان بھی کوئی گزرا ہے؟

(الفونس ڈی لے مرٹین' ہسٹری ڈی لاٹرکی)

☆☆☆

نہ ادائے دلبرانہ نہ ندائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

پھول جو میں نے چُنے

(''معراج انسانیت'' سے ماخوذ)

سیرت محمدیہؐ درحقیقت' تعارف وتاریخ ہے اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اس ذلت آمیز و کرب انگیز جہنم سے نکل کر جس میں اسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں' پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا' بلندیوں اور ہمواریوں کی اس روح پرور و نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمر باری کے اسباب ومواقع بلا روک ٹوک موجود تھے۔

(مقدمہ' ص۲۴)

☆☆☆

مسلمانوں نے جس طرح قرآن جیسے نیر درخشندہ کو انسانی تصورات وتخیلات کے بادلوں میں چھپا رکھا ہے اور اس طرح اس کی روشنی اور حرارت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ ساری دنیا کو محروم کر رکھا ہے' اسی طرح انہوں نے سیرتِ محمدیہؐ کے جگمگاتے چراغ کو بھی اپنے توہمات اور معتقدات کے دبیز پردوں میں مستور کر رکھا ہے۔

(مقدمہ' ص۲۹)

☆☆☆

جہاں انبیائےؑ سابقہ کی پیش کردہ تعلیم کائناتی حوادث یا انسانی دست برد کی نذر ہوگئی' وہاں ان حضرات کی سیرت بھی اس قدر مسخ کر دی گئی کہ وہ آنے والوں کے لئے اسوۂ حسنہ بننے کی بجائے الٹی ضلالت وغوایت کا موجب بن گئی۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر قرآن کریم نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے تمام اہم گوشوں کو خود اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح خدا کی تعلیم ہمارے پاس حرفاً حرفاً اپنی اصل شکل میں موجود ہے اسی طرح خدا کے رسولؐ کی سیرتِ مقدسہ کے اصولی گوشے نقشاً نقشاً اپنے حقیقی رنگ میں ہمارے لئے وجہ تابانیٔ قلب ونظر ہیں۔

(ص۳۷)

☆☆☆

جس معاشرہ میں عیب عیب نہ رہے بلکہ ہنر بن جائے اس کی سیاسی اور بنیادی خرابیاں کسی تصریح کی محتاج نہیں رہتیں۔

(ص۳۹)

☆☆☆

رسولؐ کی بعثت ایک ہنگامی واقعہ نہیں ہوتا کہ یونہی اتفاقی طور پر ظہور میں آ جائے۔ بلکہ یہ ایک اہم کڑی ہوتی ہے اس عظیم الشان سلسلہ کی جس کی رو سے انسانوں تک وحی کی راہنمائی پہنچائی جاتی ہے۔

(ص۳۹)

☆☆☆

دنیا میں کونسا انقلاب ہے جس کی کامیابی کی داستانیں خونیں حروف سے نہیں لکھی گئیں؟ کونسی تحریک ہے جو شمشیر وسناں کے سایوں میں پروان نہیں چڑھی؟ حق و باطل کی کونسی آویزش ہے جس کے فیصلے قتل گاہوں میں نہیں ہوئے؟ صدقِ وعدل کی کونسی آواز ہے جسے دبانے کے لئے ابلیسی نظامِ استبداد نے دار و رسن سے گریز کیا ہے؟ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔

(ص ۹۹)

☆☆☆

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا سارا مدار اسلاف کی پرستش پر ہے۔ وہ پہلے اسلاف کی عظمت لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنے آپ کو ان اسلاف کی عظمت کے محافظ اور ان کے مسلک کے نگہبان کی حیثیت سے پیش کر کے لوگوں سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔

(ص ۱۱۱)

سورج کی آنکھ نے جو کچھ اس کرۂ ارض پر دیکھا ہے اگر اس کی فلم تیار ہو سکے تو آپ دیکھیں گے کہ عقل انسانی کی تمام تگ و تاز اسی میں صرف ہوتی رہی ہے کہ عوام کو کس طرح قابو میں رکھ کر انہیں اپنی اغراض و مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنایا جائے۔ جو اس فن میں زیادہ ماہر ہے وہی صاحبِ اقتدار و ذی وجاہت ہے۔

(ص ۱۱۲)

☆☆☆

قوموں کی موت و حیات کا مدار ان کی قوتِ ایمانی پر ہے۔ اگر انہیں اپنے مسلک زندگی کی صداقت پر یقین ہے اور وہ یقین دل کی گہرائیوں میں پیوست تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے مقام سے نیچے نہیں گرا سکتی۔

(ص ۱۳۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امتیاز احمد راجا (ریٹائرڈ ایس پی)

انمول باتیں

☆ تاریخی حقائق

1- ماہرین عمرانیات نے مختلف سیاسی، اقتصادی اور معاشی نظاموں کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب وعلل اور محرکات کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی بھی نظام کی ناکامی اور کامیابی کا انحصار اس نظام کی تشکیل اور پھر اسے روبہ عمل لانے والے افراد اور اداروں پر ہوتا ہے۔

2- جو افراد یا ادارے اس نظام کو چلاتے ہیں وہی اس کی ناکامی اور کامیابی کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔

3- صرف کسی بھی نظام کو مطعون کرنے سے بات نہیں بنتی۔

4- نظام معیشت ہو یا نظام سیاست وہ خواہ کس قدر جامع اور مؤثر ہو لیکن اگر اس نظام کو روبہ عمل لانے والے افراد اور ادارے نااہل، بدعنوان، غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس ہوں تو ناکامی اس نظام کا مقدر بن کر رہ جاتی ہے اور وہی اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

☆ مایوس اور نامراد لوگوں کی دنیا

وین پر سوار ہونے سے پہلے اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس عظیم الشان ہسپتال کی عمارت کو دیکھا، حسرت بھری نگاہوں سے، جہاں وہ اپنے بیٹے کے علاج کے لئے آئی تھی۔

وین والا اس کا پڑوسی تھا۔ وہ دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی سوالیہ نظروں سے دیکھا، عورت بس اتنا کہہ سکی: ''ساڈے کول تے تیرے وین دا کرایہ وی نہیں، اے پورا لکھ منگدے نہیں''۔

وین والا شاید انسانوں کی بستی کا باسی تھا، اس نے کہا: اماں، میں نے آج تک تم سے کرایہ مانگا؟ جب تیرا بیٹا ٹھیک ہو جائے تو مل جائے گا۔

لیکن شاید ایسا ادھار کرنے والا اس عورت کو اس پورے ہسپتال سے نہیں مل سکتا تھا۔ جہاں لوگ نئی ماڈلز کی گاڑیوں میں آ جا رہے تھے۔ وہاں کوئی نہ کوئی تو تھا جو اسکے لئے ہسپتال (علاج) کی سہولت خرید کر دے سکتا تھا۔ ماہر ڈاکٹر کی مہارت اور مسکراہٹ دونوں خرید سکتا تھا۔

ان ہسپتالوں سے تھوڑی دور ایک اور دنیا ہے۔ پرانے مدقوق برآمدوں، رہداریوں میں بے ہنگم ہجوم، ٹوٹی پھوٹی میزوں اور بڑے بڑے پنکھوں کے نیچے بیٹھے ڈاکٹروں کی دنیا جہاں ملک کی اکثریت اپنے پیاروں کو ساتھ لے کر

جاتی ہے۔ علاج کی بھیک مانگتی ہے۔ میسر آ جائے تو شکر ادا کرتی ہے۔ صحت مل جائے تو سجدے میں گر جاتی ہے۔ نہ ملے تو اسے قسمت کا لکھا سمجھ لیتی ہے۔

کیا ہم چند سال پہلے بھی ایسے تھے؟

مجھے آج بھی وہ سول ہسپتال یاد ہیں جہاں صبح ہوتے ہی ڈاکٹر مریضوں کے ہجوم میں گھر جاتے۔ دوپہر تک مریض دیکھتے۔ دوائی خانے کے لئے پیچھے ڈسپنسر پڑیاں بنا رہے ہوتے۔ ڈاکٹر اور نرس ایک طرح کا رویہ لئے لوگوں کی خدمت کر رہے ہوتے۔

میرے ملک میں یہ سب کاروبار کیسے بن گیا۔ یہ رنگا رنگ دکانیں کیسے سج گئیں؟

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ چند سال قبل' گورنر' وزیراعلیٰ' بڑے سے بڑا افسر' جب کبھی بیمار پڑ جاتا تو میو ہسپتال لاہور کے ''البرٹ وارڈ'' میں داخل ہوتا۔ کوئی وزیر کسی اور شہر میں ہوتا تو اسی شہر کے سول ہسپتال کے ڈاکٹر اس کے علاج کے لئے مستعد ہو جاتے۔ صاحب حیثیت لوگ ''فیملی ڈاکٹر'' بنا لیتے۔

پریکٹس کرنے والے ڈاکٹر ''جنرل پریکٹیشنز'' کا بورڈ لگاتے۔

ہمارے حکمرانوں کی نازک مزاجیاں بڑھیں اور بیرون ملک علاج کرانے کا کلچر پروان چڑھنے لگا۔ مجھے ازحد مسرت ہوئی' جب اخبار میں پڑھا کہ پنجاب کے وزیراعلیٰ نے ''انجو پلاسٹی'' لاہور کے ایک مقامی ہسپتال سے کرا کر ایک مثال قائم کر دی۔ اس ملک میں ہر شعبہ میں بڑے لائق اور ماہر ڈاکٹرز موجود ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اپریشن کے بعد کی نگہداشت میں لاپروائی برتی جا رہی ہے۔

پہلے صرف کلینک ہوتے تھے اور محلّہ میں ڈسپنسریاں۔ اب ہسپتال وجود میں آنے لگے۔ سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹرز کی اکثریت بھی مال کمانے کی ریس میں شامل ہوگئی اور پرائیویٹ کلینک کھول کر مریضوں کو وہاں آنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مگر اس کے باوجود اب بھی سرکاری ہسپتالوں میں خداترس' محنتی اور بااخلاق مسیحا موجود ہیں' گو تعداد میں آٹے میں نمک کے برابر۔ جس کی ایک مثال (ذاتی) پیش کرتا ہوں۔

میرے کاردار کی بیٹی کو تپ دق کا مہلک مرض لاحق ہے۔ خاوند نے اس کی بیماری سے تنگ آ کر نکال دیا اور وہ بیا کے گھر سے بابل کے گھر آ گئی۔ والد بھی ایک فوجی پینشنر ہے' اور خود بھی اس موذی مرض کا شکار۔ اپنے محدود وسائل کی بناء پر عطائی ڈاکٹروں کی طرف رجوع اس لئے کرتا تھا کہ سو ڈیڑھ سو میں یہ جعلی ڈاکٹر گلوکوز کی بوتل مریض کو لگا دیتے ہیں اور ایک ٹیکہ طاقت کا۔ (جس سے) مریض کو نفسیاتی طور پر وقتی آرام مہیا ہو جاتا ہے۔

جب اس بیماری کا علم مجھے ہوا تو میں نے مریضہ کو سول ہسپتال ملکوال جو کہ ابھی تک تحصیل ہیڈکوارٹر ہسپتال کا درجہ حاصل نہیں کر سکا بھجوانے کا بندوبست کیا اور ایک تحریر اپیل کی صورت میں اور مبلغ -/500 روپے (زادِراہ) اپنے کاردار کے حوالے کئے۔

خوش قسمتی سے اس وقت ڈاکٹر منظور ڈیوٹی پر تھے جو

ایک دردمند انسان اور ڈاکٹر ہیں۔ ان کی ذاتی دلچسپی سے مریضہ کے تمام لیبارٹری ٹیسٹ' ایکسرے اور دوائیاں (ایک ماہ کی) صرف -/450 روپے میں مل گئیں اور یہ سارا کام ایک دن میں ہوگیا۔

یہ روداد بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تربیت اور ماحول کا فرق' کردار کو کتنا مختلف' کتنا بلند اور کتنا پست کر دیتا ہے۔

صاحب ثروت' صاحب اختیار اور ان مسیحاؤں کو جنہوں نے اس مقدس پیشہ کو کاروبار بنا لیا ہے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ اگر ان مایوس اور نامراد لوگوں کے آنسو نہ پونچھے گئے تو گو ان لوگوں نے انقلاب کی تاریخ تو نہ پڑھی ہوگی مگر مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں سے وہ ایک جیسا رویہ لے کر باہر آتے ہیں اور پھر جس کے کپڑے سفید' جس کے ہاتھ نرم اور چال متکبرانہ نظر آتی ہے' ان کے سروں کی فصل کٹنے لگتی ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایک اور شاعر نے کہا:

پھنسے ہوئے ہیں زمین و زماں کے نرغے میں
عذاب خلق الگ ہے خدا کا قہر جدا
میں اس کے شہر میں رہتے ہوئے یہ سوچتا ہوں
جمالِ شہر الگ ہے' ملالِ شہر جدا
ہمارے کھیت الگ ہیں' تمہارے باغ الگ
ہماری نہر الگ ہے' تمہاری نہر جدا

☆ حرفِ آخر

1- اللہ کی سلطنت میں اس کے بندے..... قیام و سجود اور مناسک و ذکر سے کہیں افضل ہیں۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دینا' کسی یتیم کی پرورش' کسی بیمار کا علاج اور کسی بے آسرا کو آسرا دینا سو سال کی عبادت' سو سال کی ریاضت سے عظیم ہے۔

2- حج تمام آزاد اور صاحبِ حیثیت مسلمانوں پر فرض ہے۔ لیکن اگر صاحب حیثیت اور آزاد مسلمان کا ہمسایہ روز بھوکا سوتا ہے' اس کے آگے پیچھے یتیم بچے بھیک مانگتے ہیں اور بیوہ عورتیں سر چھپانے کا ٹھکانا تلاش کرتی ہوں تو اس کے حج کی کیا حیثیت ہے؟

3- ذرا سوچئے۔ اگر کسی صاحب حیثیت شخص کے قرب و جوار میں لوگ بیماریوں سے مر رہے ہوں' لوگ غربت سے تنگ آ کر اپنے گردے بیچ رہے ہوں۔ اپنے بچوں کا سودا کر رہے ہوں۔ تو اللہ اس شخص کا حج قبول کر لے گا؟

4- اندھوں کے معاشرے میں سارے لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ ان میں بے شمار لوگ نہ صرف آنکھوں والے ہیں بلکہ وہ ضرورت مندوں کو آئینے بھی دیتے ہیں۔ یہ معاشرہ اتنا برا نہیں۔ اگر برا ہے' مکروہ اور بدصورت ہے تو بھی تصویر کے دوسرے رخ پر تھوڑی سی روشنی' تھوڑی سی امید باقی ہے۔

(بشکریہ بیدار ڈائجسٹ' لاہور)

(بابت نومبر 2004ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Voice Of Youth

فاطمہ صدیقی (کراچی)

''لفظ و معنیٰ کا رشتہ''

ہماری اردو زبان میں جتنے بھی الفاظ مستعمل ہیں وہ کسی نہ کسی دوسری زبانوں سے آئے ہیں۔اردو میں دیگر زبانوں کی طرح عربی الفاظ بھی شامل ہیں۔

عربی زبان فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے دیگر زبانوں سے ممتاز ہے۔یہی وجہ ہے کہ عرب اپنے علاوہ دیگر اقوام کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔

جہاں تک اردو زبان میں عربی الفاظ کا استعمال اور ان کے معنی کا تعلق ہے تو جب ہماری اردو زبان کا ارتقاء ہو رہا تھا تو اس وقت مختلف ثقافت و مذاہب سے اس نے اثرات لئے۔ایک طرف ہندوؤں کا مذہب و کلچر تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کی وسعت.....۔ جوں جوں مسلمانوں کی وسعت ہوتی گئی اسی لحاظ سے لفظ و معنی کے رشتوں میں بُعد پیدا ہونے لگا۔

عجمیوں نے اپنے عقائد بھی اسلام میں داخل کر دیے اور یوں ان کے نظریات بھی مسلمانوں میں سرایت کر گئے۔ لفظ تو علامت ہے ہماری سوچ' جذبوں اور فہم کی لیکن جب آہستہ آہستہ لفظ تو وہی رہ جائیں اور ان کے مفاہیم میں تبدیلی آ جائے تو سوچ کی ڈگر بھی بدلنے لگتی ہے۔جیسے عربوں کے ہاں (یاد رہے موجودہ عرب نہیں قدیم عرب کے لوگ جو اس وقت ادبی لحاظ سے اپنا مقام رکھتے تھے) کسی تصور یا چیز کے لئے کئی کئی الفاظ استعمال ہوتے اور بنیادی مادے سے نئے نئے معنے نکالے گئے۔مثلاً صبر کا لفظ ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب انسان بے بس رہ جائے۔کوئی چارہ نہ ہو۔ صبر کو ایک آہ کے طور استعمال کرتے ہیں۔لیکن عربی میں اس مادہ (ص۔ب۔ر) کے معنی ہیں کسی شخص کا مطلوبہ شے کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا۔جم کر کھڑے ہو جانا' ثابت قدم رہنا۔

اسی طرح صلوٰۃ ایک وسیع مفہوم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اللہ کے قوانین سے وابستگی اور اپنے اندر صلاحیتوں کا پروان چڑھانا۔ وہ راستہ جس پر چل کر انسانیت اپنی معراج کو پہنچ جاتی ہے۔ظاہر ہے جس دین سے کوئی اس قدر وابستہ ہوگا تو اس کا اظہار (نماز) اتنے ہی وفورِ جذبات اور خلوص سے کرے گا۔لیکن اگر وہ اظہار تو کر رہا ہو لیکن اس کے سامنے دین کا کوئی نصب العین (Goal) نہیں تو اس ردعمل کو منافقت نہیں تو اور کیا کہیں گے؟

لہٰذا ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم زبان کے ذریعے کوئی واضح تصور دے رہے ہیں یا محض لفظوں کے گورکھ دھندہ میں الجھے ہوئے ہیں؟؟

☆☆☆

(ماخوذ)

(لغات القرآن' غلام احمد پرویز' ادارہ طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایم۔رفیق راجا (کینیڈا)

ہندو کی سازش

ایڈیٹر طلوع اسلام لاہور، پاکستان۔

انڈین فلم انڈسٹری ہمارے اسلامی تصور کو ہی تبدیل کرنے کے در پے ہے۔ عام انڈین فلموں میں مسلم لڑکی کی ہندو لڑکے سے محبت اور شادی عام دکھائی جا رہی ہے۔ پاکستان میں اور یہاں کینیڈا میں مقیم پاکستانی اس حد تک انڈین فلموں کے زیر اثر آ چکے ہیں کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہمارے گھروں میں دیکھی ہی انڈین فلمیں اور انہی کی موسیقی سنی جاتی ہے؟ آج کل انڈین فلمیں سازش کے تحت بنائی جا رہی ہیں کہ انڈیا میں مسلمان اقلیت کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی طرح سے اگر ہم مسلمان بچوں کو برین واش کر دیں کہ ہندو لڑکوں سے شادی کرنا اور محبت کرنا اسلام میں جائز ہے تو پھر انہیں کوئی چیز یا بات روکنے والی نہیں ہوگی۔ اللہ نہ کرے مسلمان لڑکی کی ہندو لڑکے سے شادی ہو جاتی ہے تو اولاد ہندو رہے گی اگر یہ چیز آج شروع ہوتی ہے تو ۲۰ سال بعد اس کے واضح اثرات نظر آئیں گے۔ جب آپ دیکھیں گے کہ ۲۰ کروڑ مسلمان تھے ۱۰ کروڑ کیسے رہ گئے۔ ہندو پروڈیوسرز پر دباؤ ڈالنا چاہئے کہ وہ اسلام، ہمارے معاشرے اور ہماری اقدار و ثقافت کے ساتھ کھیلنا بند کر دیں۔ اسلام میں ایک مسلمان لڑکی کا ہندو لڑکے سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ چند سال قبل ایک انڈین فلم ''زخمی'' ریلیز ہوئی جس میں ایک مسلمان لڑکی کا بیٹا پوچھتا ہے ماں کیا مسلمان لڑکی کا ہندو لڑکے سے شادی کرنا غلط ہے تو فلم میں مسلمان لڑکی جواب دیتی ہے ''نہیں بیٹا مسلمان لڑکی ہندو لڑکے سے شادی کر سکتی ہے۔ یہ تو لوگوں نے دراڑ ڈالنے کے لئے ایسی رسم پیدا کی ہے''۔ یہ چیز بالکل غلط ہے۔ انڈین فلموں میں، ڈراموں میں۔ چاہے سٹیج شوہوں، ٹاک شوہوں یا ان کے عام پروگرام سب میں یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہندو اور مسلمان میں کچھ فرق نہیں۔ زبان ایک، کلچر ایک، رہن سہن ایک، ایک غلطی کے تحت ہم علیحدہ ہوئے ہیں، ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے ایجنٹ ہم لوگوں میں شامل ہیں جن کا کام ہی پروپیگنڈہ ہے۔ ہمارے کچھ ناسمجھ مسلمان بھی عام موقعوں پر یہ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہاں باہر کے ملکوں میں انڈیا کے اس پروپیگنڈے سے ہمارے بچے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ پاکستان سے جو علامے آتے ہیں وہ اپنے مفاد کے لئے آتے ہیں یا پھر وہ بھی شاید انڈیا کے ایجنٹ ہی ہوتے ہیں، اس طرف کبھی انہوں نے اشارہ بھی نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو فتوے دینے کے لئے آتے ہیں کہ وہ کافر ہے، میں مسلمان ہوں، مجھے ماننے والے میرے پیچھے چلنے والے مسلمان ہیں، باقی سب کافر۔ پھر چند ماہ کے بعد دوسرا عالم یا علامہ آتا ہے وہ فتویٰ دیتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں وہ کافر ہیں۔ اس طرح مسلمان

مسلمان کو کافر بنا رہا ہے۔ کافر تو مسلمان ہوتے نہیں۔ گویا مذہبی پیشوا کوشش کر رہے ہیں کہ جو مسلمان ہیں وہ بھی کافر ہو جائیں تاکہ ان کی دوکانداری چلتی رہے۔ کچھ سی۔آئی۔اے کے ایجنٹ ہیں اور کچھ ہندو کے۔ پاکستان بننے سے قبل بھی یہی مذہبی پیشوا پاکستان کے خلاف تھے۔ بانی پاکستان کے خلاف تھے۔ کفر کے فتوے دیتے خود فروخت ہو گئے' کوئی کانگرس کا غلام اور کوئی سی۔آئی۔اے کا غلام۔ جو فروخت نہیں ہوا تھا اس نے پاکستان بنایا۔ جب پاکستان بن گیا جو کہ ان کے خیال میں کافرستان تھا وہاں پر اکٹھے ہو گئے اور مالک بن بیٹھے' منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ انہی کی اولاد ابھی تک پاکستان میں گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔ ملک اور قوم کو سب سے زیادہ نقصان انہی لوگوں نے پہنچایا ہے جنہیں ہم رہبر سمجھ بیٹھے ہیں۔ کیا پاکستانی حکومت کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ انڈین حکومت پر دباؤ ڈالے کہ اپنی فلم انڈسٹری کو اس مذموم حرکت سے باز کرے؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ کشمیر کے مسئلہ سے کہیں زیادہ اہم ہے کیونکہ جب ہمارا مذہب اسلام ہی نہیں رہے گا تو ہمیں کشمیر اور پاکستان کس لئے چاہئے۔ دوقومی نظریہ کی اساس ہی یہی تھی کہ مسلمان امن سے اپنے ملک اور ہندو و دیگر اقلیتیں امن و سکون کے ساتھ انڈیا میں رہیں۔ جو طریقہ آج کل انڈین فلموں میں استعمال ہو رہا ہے اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمان بچوں کو ہو رہا ہے ہماری حکومت اس جانب توجہ ہی نہیں دے رہی یا پھر جان بوجھ کر نظرانداز کر رہی ہے۔ ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو چکی ہے۔

یہاں کارنیوال میں عیدالفطر سے ایک رات قبل چاند رات منائی گئی اور پروگرام تھا عورتوں کا ڈنڈیا جو کہ ہندوؤں کی رسم ہے۔ عورتیں ڈنڈیا کا پروگرام کرتی ہیں خاص کر گجرات انڈیا میں' وہی انڈیا کی رسم عید سے ایک دن قبل یہاں مسلمان عورتوں نے منائی ہے۔ مسلمان اپنی رسموں کو بھول رہے ہیں اور ہندوؤں کی رسمیں منا رہے ہیں۔

انڈین فلموں کا اثر ایسے ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک صاحب ہیں جن کا نام عبدالرحمان ہے۔ جوانی میں ایک ہندو لڑکی سے شادی کی۔ تین بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹے نے بھی ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔ بیٹیوں نے شادی نہیں کی۔ ایک بیٹی ایک سکھ کے ساتھ رہتی ہے۔ اس میں سے ایک بیٹا ہے۔ ابھی شادی نہیں کی۔ دوسری بیٹی ایک عیسائی لڑکے کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ کہاں گئی مسلمانی۔

میری التجا ان حضرات سے ہے جو کہ لکھتے ہیں انہیں چاہئے کہ صرف ہندو سازش کے بارے میں لکھیں۔ ان کی مکاری کے بارے میں لکھیں۔ ہندو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو خاص کر مسلمان بچیوں کو فلموں کے ذریعے خراب کر رہے ہیں۔

جو مسلمان بچیاں یہاں پر تعلیم حاصل کر رہی ہیں ان کی فرینڈشپ ہندو لڑکیوں کے ساتھ ہے مسلمان بچیاں ان کے پروگراموں میں شامل ہوتی ہیں۔ ہندی الفاظ باتوں میں استعمال کرتی ہیں۔ اردو بھول رہی ہیں۔ ہندوؤں کی رسمیں اپنا رہی ہیں بعض اوقات ان کی پوجا پاٹ میں بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہ سب فلموں کا اثر ہے۔

LAW OF THE JUNGLE!

By
Aboo B. Rana

==========

When we throw a birds eye view on human panorama, we will never be able to escape the fact, the only law that has stubbornly remained dominant in the common man's mind is, that 'might is right'. Even the most enlightened Muslim thinker of our times, Dr. Iqbal, at one time, was naturally compelled to say,

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا

That nest that is built on a fragile bough cannot survive long. –Dr. Iqbal

Unfortunately or fortunately, the strength or power to control our destiny has ever remained the kernel of human deeds. Indeed, I dare say, it is the most difficult and supremely sensitive of all the issues in human history, ever since man began to think. I do not know how far I will be of any use in helping to resolve this issue. Nonetheless, as they say, 'If we try we may, if we don't we won't.'

We indeed know from experience, the journey of life enriching *'sensitive ideas,'* from the acutest of minds, to be assimilated into the milieu, usually takes centuries. Most ideas are still in the process to be understood, though they began their sojourn 1400 years ago, when the Quran was revealed to the Messenger. Since our worldly problems stubbornly persist, the struggle, to improve our quality of life, nevertheless has to continue, if we want to live in harmony with ourselves and in peace with each other. In other words to transform these people, from a society where the 'law of the jungle' prevails, into a world in which human beings with angelic spirits live and roam. This transformation has precedence, since it has been accomplished by a man who brought Quran for the whole of mankind. In fact, all messengers of God have lived there lives on the same lines.

These messengers did not bring any group of followers from the outskirts of the area, in which they were brought up, who would impose their

superior standards on the local people and depart from this world, leaving a stamp of their higher quality of morals. What these messengers did do was, they changed the outlook on life of the people around them. They transformed the same community which consisted of corrupt, sick, debauch maniacs, worshipping idols, using and destroying everyone which came in their way to attain power, into a nation who submitted their lives for the cause of one God. They demolished all man-made idols and submitted their lives to the eternal laws of almighty God. The strength of these people, they believed, was in their material goods, and which was later changed by these messengers; now their strength was in their faith of one and only true God. This is precisely what Muhammad (PUBH) accomplished in his lifetime. He first united the ferocious warring tribes of Mecca and Medina, into a community of human beings, under the flag of one nation of Islam, which would live according to the laws of one God. For this, he did not ask anything, in his lifetime, for himself. After changing a bunch of blood thirsty life-haters into a nation of life lovers, by delivering to his followers and the rest of the world, the true concepts of life, he passed away from this world quietly. Quietly I write, as the glamour of Roman and Byzantine empires was still mesmerizing the rest of the world.

Immediately after Muhammad (PBUH) departed, we observe, the world began to love the way the upholders of Islam, behaved and dealt with other Non-Muslim communities. Within one generation, history saw that Islamic rule was being embraced by all races. Very much like what we saw when Pakistan came on the map of this world within one generation, as these leaders of human freedom were also in the footsteps of Quranic rules.

If we think seriously, by propagating, in this world there exists nothing else except *'the law of the jungle,'* we are implying that human *'reason'* is of no use. We are in other words, negating the powers of *true reason*—the very element in us human beings, which separates us from the animal kingdom. The power to think is the only faculty in us that helps to make life aware of its existence. Though we do find feelings in animals too. For example, once while watching a documentary on animals, I was amazed to know, when a female elephant dies, another elephant mother volunteers to provide milk and aid the baby in its growth. That a blue jay has been seen feeding another adult, by a bird watcher. On close scrutiny with the aid of a telescope, he observed that the adult jaybird that was being fed, had a broken lower beak and could not eat. Or we see kittens, those of us who have cats in their homes, playing, without hurting each other. In the same path, we have observed feelings of repulsion,

when a new comer of the same species wants to join the herd, in many of various species of animals. But this scenario has defied time. There has hardly been any change in the behaviour of animals and birds. They live and behave by instinct for their survival. I have also seen an African cow in another documentary, defeat a lioness, to save the life of her calf. Yet we all know, under normal circumstances, cows and bulls running away for their lives, from lions and other predators.

I would be more than obliged, if anyone would add to my knowledge and tell me, if any lion or a donkey has committed suicide, as it was unable to fend for himself and survive on its own, or was being humiliated by his/her fellow animals. Or that it committed suicide since it has been rejected by its own culture, for behaving differently from the rest. The struggle for power in the animal kingdom, if we observe carefully, is simply for the sake of teamwork and mere survival. Unlike, as we find in us human beings, who want to gain power, just to flaunt our bloodthirsty egos. This attitude of flaunting the big ego has always been a great part and parcel of the average person, from the times of Vikings and Spartans up to our modern day business, political and religious pirates. We human beings have divided ourselves, and are taking it for granted that running after each others blood, just like the animals do in the jungle, is the way of life. Do we ever care to think, where is this animal living going to lead us? Yes! And we get the packaged answer. *"This man is stupid. He doesn't even know that thinking is not in our fate. This world is God's problem; we are only here to suffer."*

Extreme fear and distrust of each other, is growing in our environment with every passing day. And we are so immune to this fear, that we remain ignorant to the pleasures of freedom. In the law of the jungle, if I take away another's wife it is good, but when someone else takes away my wife that is considered evil. Where is the logic or principle, for a peaceful life, in this kind of living? If this is not Satanic, when on earth can we say, that Satan is in action. And above all, we take pride in our ego building competitions. Satan has never had any logic from the very start. Millions of Muslims, all over the world, who have read and understand the Quran, know very well of the episode in the Quran when Man was created. Allah asks Satan….! Just imagine, the Creator of all universes, who needs nothing, is addressing Satan. In our human world, we refuse to even see another human, leave along talking or listening to his/her arguments, whom we consider is below our status. However, in the chapter of Al A'raaf, verse 12, it is clearly written:

"We demanded from it, as to what stopped you from prostrating before Man? It sayeth, 'Because I am superior! You made me from fire and Man has been created from clay."

What the above verse of Quran brings to light, is the fact, that Satan has made an attempt to compete with Man by applying reason and logic in response to God's question, because of its rebellious refusal. And if we carefully read, the above verse of Quran also points to the fact that Satan cannot reason. Satan is comparing between fire and clay. It is as if, to compare between a potato and a tomato. Or to ask, which is better, an engineer or an architect? There can be no comparison between the two. They both have their own purposes, as both have been created to serve different occasions. And Satan always compares, to create trouble between two parties. That is, Quran's words teach us, what Satan does to break the unity in humanity.

Though we find that indeed Satan accepts the responsibility, and takes it upon itself, the option to refuse the command of God. Again we find that Satan is attempting to compete with Man, by choosing to use freedom of choice, which has not been granted to it. But then we also see there is absolutely no logic or sense in Satan's reason. Its refusal to prostrate is based on sheer fanatic arrogance. Just for the sake of its ego, or to make itself stand out, Satan refuses to obey God. Later, when Satan comes in the knowledge of the consequences of its refusal (chapter 15: verse 34), it throws the blame back (in chapter 15: verse 39), on God.

Saying, "My Lord, who am I to disobey?"

This episode makes us aware of Satan's tactics and its shallow character. Not only that, Quran also makes us aware, that Satan still has the audacity to ask from God, permission to be given freedom till the Day of Judgment. In other words, it's asking for permission means that its refusal to prostrate before Man is justified. Satan is persistent, that the bottom line is, it was God Himself which made him refuse to prostrate. Whereas on the other hand, we find, Man admits his fault before God, saying, "Our Provider! We have been cruel to ourselves. If Thou will not salvage us, we face annihilation" (Chapter 7: verse 23). Just for the sake of arguments, in the granting of permission to Satan till Doomsday, it seems apparently, as if God has taken a liking for Satan. But time will tell us more about it, when the story of mankind will unfold, as our knowledge of this universe progresses. We shall know better of the wisdom of God why this Evil was put among us.

This episode of Satan has been brought in, just to explain, in the law of jungle also, when it comes to matters of survival there are no reasons. For those of us who claim to believe in the One and only God, He has been sending His Messengers to teach us on how to stay away from Satan's demonic intrigues and they have also demonstrated ways, to let us know, as to how we can attain peace with each other. God has revealed in the Quran a system for us, called Islam. What we read and observe nowadays is that the true Islam of God has been twisted and perverted by those who have vested interests. The present Islam, we all know, has been divided into sects, because of the ignorant attitude of Muslims. We also know that no Messenger of God had divided the revealed laws of life, into different sects. And every sect claims to be in the footsteps of the Messenger. This again is also not possible. Why can't we simply say that we are 'Muslims' instead of asking each others' castes and sects? Is it power that we are seeking in our lives or is it peace? If it is peace we want, then why don't we take measures to stop this lust for power in ourselves?

None of the Messengers wanted power for themselves. The Messengers only followed what had been revealed to them by their Creator and asked their followers to do the same. We all know that Islam as a system is now nowhere being implemented in this world. The Islam that most of the Muslims practice today in their daily lives, candidly speaking, is bringing disgrace to the true Islam. Wearing a *hijab* on top and tight jeans or see-through dress under it is called Islam. This kind of Islam is not even funny. In fact, God promises to true Muslims, both peace and piece, in this world. In the prevailing Islam of today, there is only piece and no peace. Why can't we revise the laws of true Quranic Islam, and make Islam more peaceful and appealing to the world? Instead of directly or indirectly trying to dominate each other, why can't the Muslims be an example, if they claim to be in the footsteps of the last of the Messengers? These are the questions in every Muslim mind. In the cut-throat and competitive society of today, where everyone is fighting for his/her survival, no one has time to think. In fact, the job belongs to those who claim to be the administrators and executives of our modern Islam. Muhammad (PBUH) succeeded in his life in changing the hearts of his enemies by giving them a fresh way of glancing at life, instead of creating hatred for Islam. I am not stating it is an easy task, at the same time, we can also do the same, by eliminating ignorance from amongst us. But this needs a collective effort with modesty and humbleness, because the shores of stupid and ignorant passions are raring loud and clear. What each Muslim must think is, will there be lasting peace with power or will it be more enduring peace when we co-operate with each other to eliminate ignorance and have a tolerant attitude?

Some years back there was a pandemonium. The uproar took place because the priestcraft succeeded in out casting or out classing the Qadianis from the Muslim world, just because Qadianis did not terminate the Divine revelations with Muhammad (PBUH). And what progress in Islam did they achieve by passing this dogma? The cost of living was still on the rise. Criminals were still roaming on the streets, just like now. Bribery and nepotism still flourished. How much of character and greatness have the rest of the Muslims shown to the world after declaring one sect as a Non-Muslim? They labelled Qadianis as Non-Muslims, while on the other side, those who preach Islam from the pulpits are negotiating deals with agnostic, atheist and other Non-Muslim nations. Another bunch of confused neorots that is what these preachers are!

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

Usurping, cheating, swindling, nepotism, debauchery are only to name a few adjectives. Just name any vice and the rest of the Muslims are full of it. We Muslims are very fast in spreading hatred, slaughtering each other in cold blood, or hijacking Islam. And how fast are we, may I ask these Muslims, in bringing unity among ourselves or trying to understand each others issues? To bring unity among us, we look towards Non-Muslim nations; those nations that we reckon as blood suckers and life haters. Is that not a matter, gentlemen, to stop and think for Muslims? No wonder Allama Iqbal went away saying, "Your forefathers lifted their heads with pride, because they were Muslims; but you all have disgraced yourselves, by leaving out the Quran." Or as another poet Ghalib of the east, with his intoxicating sarcasm, murmurs:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

Nations are not built by strengthening the criminals and having a total disregard for the educated class. During my two decades of stay abroad, I did not come across a single person of brown, black, white, or yellow race, from any country with a Masters degree in education, working for his/her living doing odd jobs, anywhere in America or Europe; except Muslims from Pakistan, Afghanistan or perhaps an odd one from Iran. This is the kind of respect we give to those who spend 16 to 18 of their precious years, going to schools, colleges and universities. We throw our educated in the garbage lot and then grumble and gripe about brain drain in the country.

How can we expect any social system to grow stronger, when our surplus is given away to feed the criminals or inflate the egos of life haters? All the drug addicts, alcoholics, gamblers and weasels are gaining strength, while those who sincerely are eager to learn and educate themselves, are given the streets to play with these idiotic, stupid and perverted minds. Until their innocent lives begin to stink like the rest. In an Islamic system there is no surplus in the hands of individuals. Where there is no Islamic system, a Muslim is expected to come to the aid of the needy. And we are fond of those whose lust for power can never be satisfied, or those who are stubborn and refuse to change themselves. Gentle minds, we very well know, there is no limit to the lust for power!

We all know, what ought to be done, when there is only one jug of water and five individuals are thirsty. One person takes away more than half the jug of water. How much of a share of water will come to the rest four. That one person who took away a major portion of water only wants the other four to remain subordinate under him. Not because he deserves it, but because he becomes cold hearted in his/her lust for power. We are well aware of this problem in our economic systems. But what are we doing to rectify this menace? And we get the same old readymade answer from our preachers,

"Leave it to God."

Of course, we are leaving it to God. At the same time, if we want to sincerely and truthfully develop a relationship with God, we cannot bluntly refuse to stop and think what God is asking from us. We are observing on our TV sets, magazines and newspapers everyday, as to what is happening with Iraqi and Afghani Muslims. And yet we choose to remain stubborn in our habits, because we think we are better Muslims than our neighbours. O really? Pray, I could think like that!

My last question is, do we want to be governed by a peace loving God or do we need Devils' advocates who are fooling the public in the name of Islam? If we want the peaceful God to listen to us, then we shall have to change our attitudes, our idiosyncrasies, our nomenclature and our whole way of looking at life. Gentlemen, Islamic system cannot be brought by giving away bribes. These preachers can fool the public, but if they believe they can play God, they are living in a fool's paradise. Times are proving, the old methods of worship are becoming a spent force now and bring in more problems for the average Muslim. In plain words, His Universal Lordship is

not willing to bless us, since we are more inclined and bent on remaining stubborn, stupid and ignorant. We like to play in the traps of Satan in this brave new jungle that Satan has created for us. Educated and live nations do not waste, mince or make words meaningless. Education will always revere the signs of good language. Gentlemen, there is power in true *'reason,'* provided we search from the core of our hearts and not hinder Truth. That is why Iqbal desired:

تا ز غیر اللہ نہ دارم ہیچ امید
یا مرا شمشیر گرداں یا کلید

تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من
محنتے دارم فزوں از کوہ کن

(I do not want to expect or have hope from anyone else except Allah! For that, either I need to be armed with resources, to break the arresting shackles. Or I need enough mental alertness, to have the key to solve these riddles. Kindly sharpen my axe, as my work is harder than a mountain conqueror).

==========

ALAM TARAA?
(HAVE YOU NOT SEEN?)

By
A Rashid Samnakay, Western Australia

==========

Dear Uzmeenaa and Abid
(Salaam to you both.)

You ask, why have we (Muslims) not produced scientists of note lately? Your question is rather 'loaded', in that we have not really produced scientist of any significance for the last few centuries. It is also ironic in that when we find that our only book of *Iman* (Faith), the *Qura'n* extols us over and over again to pursue the scientific line of enquiry in understanding the working of nature, we have for centuries "turned our faces away from it!" (12-105) That is the simple reason why.

Why is it important to pursue the scientific enquiry, that is, *understand* and -*know* the workings of nature and universe? The answer lies in the fact that God has thrust on mankind the responsibility of 'control and management' of the resources in the universe. That HE has bestowed upon us - *do you not **see** (alamtaraa) that God has subjected (musakkhar**)** to your use all things in the heaven and on Earth-31-20?.* The word 'alamtaraa' and 'musakkhar' are key -words and of great significance.

Without '*knowing and understanding the nature*' of resources, any production engineer or manager will tell you that you will not be able to **efficiently** produce the products that you require for your use. See my children, how Qura'n leads us from one thing to another? Efficiency is similarly a significant word. Generically you would say it simply means Efficiency = output divided by input, the result often expressed as a percentage. The difference between input and output is 'loss' or wastage.

Not a big deal you would say. But taken in the broader context of expenditure of energy, minimising wastage (and therefore conserving of resource), extraction methods, transport, handling, employment of people, safety aspects, environmental issues, total cost etc just to name a few, opens up a Pandora's box to the meaning of *knowledge* and *understanding, control and management* in order to fulfil God's command not to waste and be loved as in the verse, 7-31 where it says *for God does not **love the waster**.*

When the above is attached to efficiency then it takes a whole lot more meanings in that the very essence of our *iman* of wanting to be loved by God becomes very significant and we are extolled to examine- *alamtaraa*- under a microscope of knowledge and understanding.--

To give you just one more example in the Qura'n of the injunction to *know and understand* –study – we will look into verses 35-27&28 : *Do you not* ***see*** (*alam taraa*=study) *how Allah causes water to fall from the sky and from it WE produce products of different kinds and colours (*types*), and from mountains layers white and red and different colours and pitch black too.*

*Also from mankind, insects and cattle, different kinds and colours (*types*) similarly. Those truly are in awe of God (full of humility) among HIS servants who have(*scientific*) knowledge, for God is exalted and oft forgiving.*

When we dissect the above verses we can make a long list of scientific disciplines referred to in it. For example climatology, cloud physics, meteorology, hydrology, agricultural sciences, mineralogy, human and animal biology and even genetics. In the Qura'n, references to other scientific disciplines are endless, for example embryology, cosmology, astrophysics etc. It was the pursuit of this knowledge that the first five hundred years or so of Muslims made them the rulers of the world. Please make a distinction in calling the Qura'n a 'book of science' which it is not, but a book 'referring' to scientific phenomena to make us "think" of lord's greatness.—

What is more important in these verses (not related to your enquiry) is the fact that it defines persons of knowledge (*Ulamaa*) as scientists and then attaches an attribute or quality of '**humility**' in them, for they, the Ulamaa (the scientist) having understood the wondrous workings of nature are in total awe of God's greatness. The more they *learn* the more they are conscious of their own ignorance, and therefore more humble. Thus **knowledge and humility** go hand in hand.

This aspect of humility comes out so obviously in the life of the great minds of science, for example Einstein and Newton, in contrast to our 'religious ulamaa' who paddle their vested interests, such as power, status and piety and are more interested in - *alladhina hum uraaun (107-6-) those who want to be seen by others* (show offs)!

You may as well ask, why is there a reference to God being most forgiving? What has science and forgiveness got to do with the above?

Obviously; with arrogance, that is lack of humility comes 'pride' and that God does **not** like. HE does **not** love proud people (4-36). Hence the truly knowledgeable are

humble, full of humility which pleases God. With the acquisition of knowledge they cast aside their arrogance and thus become eligible for forgiveness, and HIM being most forgiving HE forgives them for errors on their part.

This then brings us back to your original question of lack of Scientist amongst Muslims in recent years. In fact for the last few centuries really!

But first, when I criticise our Muslim community (*Ummah*) for the lack of scientists in "-- science" I am reminded of a couple of mathematicians and even recent nuclear scientists. Also the fact that, admittedly we are turning more and more towards medicine, engineering and electronics as our choice of profession, which is admirable; they are all science based disciplines. But as one Bishop has taunted us by saying "what have they (Muslims) contributed to the benefit of mankind in the last few centuries?" I would say "not much" and for that I get dirty looks. (fatwas are going out of fashion lately)

I give you one example out of many and that is this; following the discovery a few years ago by NASA scientist of the Hubble Space Telescope called the 'Cats Eye Nebula', a beautiful picture was published of the nebula which looks like a ***red flower*** with bright blue and white dot in the middle of it and a bit of golden yellow on the edges. NASA called it the cat's eye for it also does look like one. (there is a CD available with stunning pictures of nebulae)

There was a flury of e-mails to websites and letters of congratulations in the so called Muslim press reminding us of verse 37 in Surah Rahman viz- *When the sky is rent asunder and it becomes red like* ***a rose.--***

This flury was because it was claimed -- "look, look! our Qura'n has had this in it for fourteen hundred years when there was not even a magnifying glass let alone telescope". --My reply to it is, big deal! It has been there for fourteen hundred years and Muslims had a head start of centuries to discover it!! Why then did it take non-Muslims to find it first?

And what right have we to jump up and down with joy when the so called infidels have discovered it for humanity? Instead we should be thanking them for discovering it and reminding us of the greatness of the Qura'n. We should be hanging our heads in regret(not in shame, for we were great once) that, in spite of the fact that these things have been there for so long, we did not discover them ourself? Don't we read our Book??

The Qura'n extols us time and time again to study science so that we may understand the workings of the universe and acquire the place in the world that God wants us to achieve. The verse 2-164 is of similar nature as the above, and ends by saying *laayaatil liqomin ya'qiloon*- these are signs for people who are wise (have *aqal*). It is all there but we have turned Qura'n into a "*religious*" book for the nebulous thing called *thawaab*, instead of a book of codes and guidance for mankind- *hudallilnaas*. A poor soul called Maahirul Qadiri equally sensitive to these things wrote a lament in Urdu on the treatment we give to the Qura'n. I have added a couplet of my own (which may not be of acceptable standard of poetry) thus:

Maiyet ke sirhaney gaa gaa ker
Murdey ko sunaayaa jaataa hun!
(they sing me at the head bord of the corps -- to recite (*for thawaab)*
to the dead body)

My dear children, I hope you will turn your attention to Science studies as a Muslim should in order to be a 'Muslim and be loved by God'. Admittedly not every body can be Abdus Sattar or Abul Kalaam but it has been long distance between the oases. That is between the first and the second millennia of Muslim rise and fall. By the same token any honest profession, even carpentry or hawking goods for sale is an honourable profession to obtain a decent living and is a service to mankind. Science is not the only discipline for that purpose.-

I am only trying to draw the attention of our intelligentsia at large towards its ethos- the habitual character and disposition - of the Qura'n and *ilm* (knowledge), of all kinds and particularly science. For it is essential to contribute to the wellbeing of humanity by understanding the workings of laws and therefore obtain salvation. Qura'n says- *After reflecting upon the creation of the heavens and earth, the people of knowledge cry out, "O our sustainer! YOU have not created this universe in vain or for destructive purposes. YOUR scheme of things are much above flaw. Grant us the insight to understand the functioning of these things, so that we benefit from them and remain safe from suffering" (3-190)* Convey my salaams to all.

Dadajan.

==========

CAMBRIDGE UNIVERSITY

KASHMIR SOCIETY

By
Saima Hameed

==========

Cambridge University Kashmir Society endeavoured to make the last year an eventful and meaningful one- and one that raises concerns about issues pertinent for Kashmir and her people. The 'Azad Kashmir school trip' organised by the Cambridge University Kashmir Society in conjunction with Kashmir International Relief Fund that took place between August and September in 2004 was an attempt to send volunteers from Cambridge and around the UK to Azad Kashmir- the aim being to encourage a cross cultural understanding of the problems of the people of Azad Kashmir and help to build a relationship on trust and support between students who take an active interest in Kashmir and the civil society in Kashmir.

The trip, which was open to all students to apply and in which the students volunteered to buy tickets and go and teach in Kashmir, showed the resolve of these students and took place owing to the kindness of Kashmir International Relief Fund who sponsored the stay in Azad Kashmir.

Shama Akhter, the 'liaison officer' for our society, a second year 'education and religious studies' student at Homerton, was accompanied by an enthusiastic Raja Akhter, a Maths teacher at London; Mehvish Chaudhry, an upcoming vibrant, and industrious Law student from Kings College in London, and Nosheen Masud, an intelligent and dedicated worker for the KIRF and Mr Ishfaq Ahmed from KIRF (Kashmir International Relief Fund).

Having spent months trying to plan this trip for the Kashmir Society at Cambridge, I was ecstatic when it was finally about to take off. Most of all I was grateful to Kashmir International Relief Fund (henceforth KIRF) for coming to our rescue, and agreeing to sponsor the visit whilst the students were in Kashmir. KIRF were in fact a blessing in disguise- I remember speaking to Mr Ishfaq Ahmed (CEO of KIRF) in February or about March where I learnt

about the tremendous amount of welfare work the organisation does in Kashmir.

From having various schools for young boys and girls to study in Mirpur, Kotli and near the line of Control in Saholna, they have regional offices in Mirpur, Dewarian and several medical centres in Mirpur and Kotli. They also provide teachers to those that live in 'refugee camps' and who have left 'Indian occupied Kashmir' for Azad Kashmir in search of a better life. To encourage secondary education KIRF also operate a mixed high school in Bagh for twelve to eighteen year olds where more than three hundred children attain their education. In addition to this, they operate 'women's vocational centres' where they encourage women to sew and sell their intricate embroidery for prices that will enable them to live a decent living.

Mr Ishfaq Ahmed shared with me his desire to encourage exports of their work to the developed countries. He wants these women to improve their skills further by some sort of program where they may know to what audience they are selling so that they may tailor to their needs and heap a share from the process of globalisation that has encompassed the lives of people in the now developed world.

Mr Ishfaq Ahmed also explained to me and the others in a meeting how he saw that 'giving' and 'sharing' with others enriched ones soul, self pride and self worth. In a meeting with the participants, he reminded us of a verse from the Holy Quran whose essence was that one must give away all that which is in excess of ones needs. Certainly this is true of a progressive society, but he feels that by buying Kashmiri goods, arts and handicraft we are not only encouraging a people but also helping those that are in need and perhaps living in circumstances that are not as privileged as ours.

On their return and whilst conversing with Shama she explained to me how intrigued she was by KIRF's 'gynaecology hospital, their medical dispensaries, eye camps, water supply schemes, schools, and vocational training centres all over Kashmir. She agreed with Mr Ishfaq Ahmed, in which he had said that where governments remain silent and oblivious to her people, it is organisations like these that have to supplement. KIRF is one of the few organisations providing gynaecological support, to these women that live in far flung villages in Azad Kashmir, where no doctor or nurse would ever

otherwise want to go. It is not that medical staff does not want to go but that the 'big push' which Hirschman talked about with regards to development in the UK, has just not happened.

And how does KIRF get its funds? Mehvish explained to me that by comparatively wealthy individuals donating in the UK to Kashmir, these funds can be productively used to improve people's lives – it can provide them with clean water, education, hospital services. Shama, Mehvish and Raja saw first hand what and how the money was being spent on. Additionally they volunteered to do a 'thirty three kilometre' walk near the beautiful 'Neelam valley' to 'Dewarian'. By doing this sponsored walk, they hoped to raise further funds for the cause of Kashmir and her people.

Mehvish and Shama taught 'english' and 'english' and 'religious studies' respectively. They also tried to improvise at the 'women's vocational trianing canters' and Raja taught mathematics. He was awed at the abilities of these students – they were doing intricate mathematical calculations without even using a calculator! They taught in three different schools, one was in a refugee camp, initiated and run by KIRF, and the other two schools were in Bagh, and KIRF was also overseeing these projects.

Having spoken to Shama, Mehvish and Raja, they have all reiterated the great time they had in Kashmir, how it was such an awesome way to spend a holiday. In fact they had travelled to such far-flung areas in Kashmir that even the local population had not even visited these. From staying with their guide Zulfiqars family to living in a comfortable hotel in Muzaffarabad, they were able to appreciate life in Kashmir from different angles. But most of all they were able to appreciate city life much more - the trip broadened their horizons, opened their eyes further, and enabled them to 'give' and share much more.

I would like to thank Kashmir International Relief Fund, Mr Ishfaq Ahmed, and Nosheen, for being so patient and understanding, and so helpful throughout this project and enabling it to come to fruition. Moreover, I would like to thank the participants for being so brave and endeavouring and participating in this pilot project that came in to existence with the cooperation of the Cambridge University Kashmir Society and Kashmir International Relief Fund.

==========